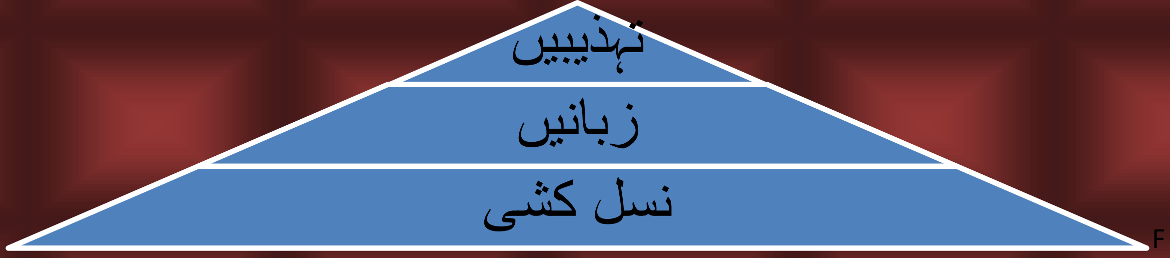
" زبانوں کا قتل عام : تہذیبِ مغرب (اور بروشسکی زبان) کے تناظر میں "



"The Genocide Of Nations And Languages "

از

سید خالد جامعی

Karachi University Research Forum

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے دانشمندانہ مباحث

تحقیق ہذا اول جریدہ عدد : ۳۰ ،طبع از شعبہ تصنیف و تالیف ۔جامعہ کراچی
اور ماہنامہ ساحل کراچی میں شایع ہوا تھا ،ادارہ ہذا کے ناطم کی اجازت سے
آن لائن نسخہ شائع کیا جارھا ہے۔

تہذیب،سرورق،فہرست ،تعارف و پیشکش
محمد علی جنید

6.8.2016
Monologue™

www.kurfku.blogspot.com

www.facebook.com/kurf.ku

Karachi University Research Forum

تعارف

انسانی زبان کی نوک اور حلق سے اس کے ربط کے بعد جو علامتی صوتی اظہاریہ متکلم کی زبان سے نکل کر صوتی علامتی اظہاریے کی شکل میں سامعین تک منتقل ہوتا ہے اُسے زبان،بولی کہتے ہیں۔ وہی زبان بولی حضرات جنہیں أپ اور ہم سب اردو میں زبان،عربی میں لسان اور انگریزی میں لینگویج کہتے ہیں ۔

زبان کا تعلق اقوام اور تہذیبوں سے ہوتا ہے قطع نظر اس کے کون عصر حاضر میں درجہ مادی اُصول کے نقطہ نظرسے ترقی یافتہ ہے یا ترقی پذیر یا پھر انکا تعلق غریب مُمالک سے ہے۔

تہذیبوں کی ترقی یافتہ شکلیں اکثر بیشتر اقوام کوخود ساختہ اعداد و شمار،معیارِ مادیہ کے گورکھ دہندوں میں پھنسا کر اپنا جوازِ برتری قایم کرتی نظر أتی ہیں ،یورپ نے اپنی استعماریت میں یہی کلیہ خوب استعمال کیا اور أئی۔۔ایم۔ایف اور ورلڈ بینک کے ذرئیعے اورا نکی تحقیقاتی رپورٹوں کے ذریعے خوب کھیل کھیلے۔

چیمبرز لغتِ انگریزیہ کی رو سے :

1. Language is the ability to use speech to communicate.

2. Language is (also) the speech of a particular nation or group of people [1]

یعنی زبان سے مراد وہ قوتِ گویائی ،تقریر یا بیان (گفت و شنید) ہوتا ہے جس سے دو یا دو سے زائد افراد باہم تبادلہ خیال کرتے ہیں ۔

واضح رہے یہاں تقریر سے مراد سیاسی اور غیر سیاسی موقف کی بابت طویل اظہاریہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ علامتی گفت و شنید ہے جو اظہاری علامتوں اور حروف سے ترتیب پاتا بیان ہوتا ہے جس میں اقوام کے حروفِ تہجی کے سبب تفریق پائی جاتی ہے ۔اور اہل زبان و زبان شناس جس س واقف ہو کر باہم تبادلہ خیال کرتے ہیں ۔

---

[1] **Chamber 's Essential Dictionary .chambers harrap publishers .1998.pp:532.**

زبان کا تعلق صرف سمع وقوتِ گویائی سے ہی نہیں ہوتا اس کا تعلق ،تحریر سے بھی ہوتا اور تحریر سے ہماری قوت بصر اور لسانی واقفیت ہمیں معنی و مفہوم تک رسائی فراہم کرتی ہے۔

تحریر کبھی حروف تہجی کی صورت میں پائی جاتی ہے تو کبھی علامتوں و تصویری اظہاریوں کی شکل میں ملتی ہے ۔دو افراد کا باہم ان علامتوں ،حروفوں کے معنی مفہوم اور نحوی تراکیب سے واقف ہونا لازمی ہے ورنا تبادلہ خیال[2]

ممکن نہیں ہوتا۔

مطلب زبان سے مراد وہ اہل زبان کی باہم مشترکہ قابل فہم علامتوں کے ذریعے تبادلہ خیال کی سرگرمی ہے ،جس کے ذریعے وہ وہ اپنا مقصد،مطلب اور مافی الضمیر باہم اظہار کرتے ہیں۔ ہم یہ امر جا بجا محسوس کرتے ہیں کے اہلِ دانش و حکمت[3]

نے لسانیاتی مباحث کو فلسفیانہ نقطہ نظر سے بھی موضوعِ بحث بنایا ہے ،وہ اسے کبھی مصنوعی اشاری نظام کے طرز پر دیکھتے ہیں تو کبھی خاص حروف ِ تہجی و علامتوں کے مشترکہ معنی مفہوم کے ضمن میں بھی اس پر غور و خوض کرتے ہیں ۔

اہل مذہب اِسے وحی شدہ یا تنزیل شدہ کلام الہی کے ذریعے سر چشمہ ہدایت جانتے مانتے ہیں ۔زبانوں کو ماضی ،حال اور مستقبل میں ظاہر کرنے کے لیے نحوی اُصول اور تراکیب بندیاں قایم کرنی پڑتی ہیں ،زبانیں عموماً تخلیق نہیں کی جاتیں بلکہ صدیوں کے ارتقا سے تشکیل پاتی ہیں انکو بولی کے طور پر اول بولا جاتا ہے،زبان بعد میں مانا جاتا ہے اور لکھا بعدِ ازاں جاتا ہے اور انکے اصول و ضوابط نحوین[4]

ترتیب دیتے ہیں ۔

ایک طبقہ نے اضافی نقطہ نظر سے اسے مافی الشعور کو ظاہر کرنے ،احساسات،خواہشات اور تخیلی نقطہ نطر سے بھی ہدفِ توجہ بنایا ہے۔[5]

---

[2] communication

[3] Philosophers and thinkers

[4] Gramerarians

[5] عبدالقادر،ڈاکٹر ۔کشاف الاصطلاحاتِ فلسفہ ۔ شعبہ تصنیف و تالیف ،جامعہ کراچی،صہ :۲۶۵۔

زبان کو معروضی و موضوعی نقطہ نظر سے بھی ماہرینِ ادب و لغت نے دیکھا ہے جیسے غور کریں اس جملے پر کہ :میں انسان ہوں .. پر اس میں انسان ایک معروض[6] ہے ، میں جو انسانی انا کی اور خودی کا اظہاریہ ہے اس میں ایک موضوع [7]

ہے ،ایک طبقہ انسان کو موضوع گردانتا ہے ،اسی طرح یہ تشکیلی نقطہ نظر سے اردو کا کامل با معنی جملہ ہے اب اگر اس کی تخریب کی جائے اور رد تشکیل کرکے جز میں بانٹ دیا جائے تو :میں..انسان..ہوں جملہ ٹوٹ پھوٹ کا نشانہ بن کر بھی کام کی شے ہے۔

یعنی میں کے اندر پوری انا ،ذات اور خودی ملتی ہے تو انسان میں ایک خارجی شہ کا احساس ہوتا ہے تیسری طرف غور کریں تو یوں دونوں کی کامل یکجائی اور وحد ت کو متشکل کرتا ہے۔

لاینبز(١٦٤١...١٧١٦) کو دیکھ لیں موصوف نے ایک أفاقی ریاضیاتی زبان کا خواب دیکھا تھا،اِس نے سوچا کے ایک أفاقی لسانیت پروان چڑھائی جاسکتی ہے اور علامتی طریقہ اس ضمن میں بروئے کار لانا معقول امر ہوگا ۔

اس نےلہذا اس ضمن میں لسانی درجہ بندی بھی کی جیسے درجہ اول کو لے لیں جو سادہ مختصر علامتی تبادلہ خیال کی علامت ہے اور اس میں سادہ الفاظ و سادگی اور سلاست ملے گی ،اصطلاحاتی بوجھ اور پیچیدگیاں ،طوالت مضمون سے بچا جاتا ہے۔

اور جو الفاظ ،سادہ جملوں اور مختصر مضمون سے بھی ظاہر کئے جا سکتے ہیں ،جب علامتیں گنجلک،پیچیدہ، اصطلاحاتی رسمی بن جایں اور عبارتیں پیچیدہ بوجھل اور اہل علم و فن کے کام کی شہ بن جا یں تو اس کو درجہ دوئم گردانا جا سکتا ہے، لائبنز کے خیال میں اس کے لئے ایک لغتِ خاصہ بھی مرتب دی جا سکتی ہے۔[8]

ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی اور حیوانی جبلتوں میں تفریق واقع پذیر ہوئی ہے ،،جیسا کہ ہم اس امر سے واقف ہیں کہ انسان اپنے خاندان،ماحول،کسب سے زبان بولنا سیکھتا ہے۔

اور اپنی اپنی مادری زبان سے أگاہ ہوتا ہے ،بتدریج کسب و رواج،علم و مہارت سے اس میں اضافہ کرتا جاتا ہے ،اس کے مقابلے میں حیوان ،چرند،پرند ،چوپائے دیکھیں

---

[6] object
[7] subject
[8] عبدالقادر،ڈاکٹر۔ محولہ بالا ۔

تو انکی زبان علامتی صوتی و یکساں نوعیت کی حامل ہوتی ہے اور اس میں اغلباً جبلت اور ماحول کا بھی ہاتھ ہوتا ہے اور یہ عموماً جسمانی حرکات و سکنات۔[9]

میں اظہاریہ سرانجام دیتے ہیں بلی میاوں میاوں کرتی رہتی ہے اور جب غصے میں انکا سامنا ہو تو خاص طریقے سے غراتی ہیں جسکے بعد عموماً انکا تصادم ہوجاتا ہے۔

ہم کسی حیوانی بین الاقوامی زبان ،بولی ،لغت سے واقف تو نہی ہیں پر پرندے چرند کے مقابلے میں متحد اور مسلسل ایک جیسی أواز کی گردان کرتے ہیں ۔فرض کریں کوئل کو ختم کیا جائے تو دنیا اسکی کو کو سے محروم ہوجائے گی ،طوطا ٹیں ٹیں کرنا جبھی چھوڑے گا جب طوطا ہی معدوم ہوجایئے ،لہذا قوم کا مادری زبان چھوڑنا،کسی اور قوم کی زبان اپنانا ،انا ،خودی ذات کی موت کے ساتھ ذہنی غلامی کا أغاز ہوتا ہے ،پھر اگر قوم کو ختم کردیا جائے تو زبان بھی بولنے والوں کی موت کے ساتھ ختم ہوجائگی۔

اقوام کا قتل عام زبانوں کا قتل عام ہے ،بڑے انسانی گروھوں کا جہاں قتل نا ممکن ہو تو وہاں انکی زبان کو ختم کردو اُسے دوسری زبان کی لت ڈال دو ،اس پر ثقافتی غلبہ لسانی برتری کے ذریعے ڈال دو ،کئی طریقے ہیں تہذیبوں کے قتل عام کے ضمن میں جو بروئے کار لائے گئے ہیں۔

ہر قوم کا ایک خاص طرز بیان ،بولی،سانس کی پھونک ،حلق سے ربط زبان کے بعد صوتی اثر سامعین تک منتقل ہوتا ہے،وہ زبان کی حفاظت اور ماضی،حال اور مستقبل میں وقع پذیر واقعات اور حالات کے بیان کے لئے خاص علامتیں،نحوی اُصول و ضوبط اختراع کرتے ہیں۔

جو اُنکی زبان کو تحریر اور بول چال کے لحاظ سے دیگر زبانوں سے منفرد بناتے ہیں ان زبانوں کے بھی نسلی و جغرافیائی بنیادوں پر خاندان ہوتے ہیں ،جن کے سبب بعض الفاظ اُن میں یا تو مشترکہ ملتے ہیں یا پھر معمولی تغیر کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

ایک قیاس یہ ہے کہ زبانوں کے لحاظ سے دنیا میں چار ہزار بولیاں بولی جاتی ہیں اور ایسی ہی ہزاروں بولیاں معدوم ہوچکی ہیں ۔[10]

---

[9] **Informal ..Body Language .**

[10] **LANGUAGE :Collin's Encyclopedia .Harpers Collin's Publishers .2006.vol:5.pp :362.**

ایک اور اندازہ کے مطابق دنیا میں بولی کے لحظ سے سب سے زیادہ مینڈرین (چینی زبان) بولی جاتی ہے جسکے بولنے والے دو ارب کے قریب ہیں انکے بعد اردو یا ہندی بولی جاتی ہیں ، جو پاکستان ،ہندوستان میں مسلم اور ہندو فرقوں کے لحاظ سے فارسی اور سنسکرت رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں مگر بولی اور زبان قریباً یکساں ہیں ۔

پھر انگریزی زبان أتی ہے جو کل برطانوی سابقہ نو أبادیوں بشمول،أسٹریلیا،امریکہ ،نیوزی لینڈ میں بھی بولی جاتی کا عدد و مقام أتا ہے ،اسکے بعد عربی،فرانسیسی،جرمن،لاطینی زبانوں کا مقام أتا ہے۔

زبان و ترقی کا تعلق ہتھیلی و انگوٹھے کے تعلق کی مانند ہے ۔ذرا غور کریں انگریزوں کی أمد س قبل مسلمانوں کی علمی حالت زوال کے باوجود اعلئ تھی اُن میں انگریزوں کے اعتراف کے مطابق جاھل ملنا مشکل تھا ،ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان کو جاہلوں میں تبدیل کردیا ،یہ میں نہیں کہتا یہ ہنٹر صاحب [11]

کا کھلم کھلا اعتراف ہے ۔

انگریزوں نے جب سیاسی استقرار حاصل کرنا شروع کیا تو

اُنھیں احساس تھا کہ کیسے انھونے مسلمانوں کا اقتدار گل کیا تھا ،انھیں اب سیاسی نوکر شاہی کی بھی تبدیلی مطلوب تھی،تو انھونے نئے علمی محاذ کھولے۔انھونے مستشرقین کی جماعت سے تحقیقات کرائیں جسکا حاصل وصول یہ تھا صاحب کے مسلمان یہاں محمد بن قاسم ،غزنونی کے دور سے غاضب چلے أرھے ہیں اور ،انکی قوم ایک شدت پسند مذھب پر استوار ہے اور ہندو ایک مقامی عظیم قوم ہیں ہن یہ دیکھتے ہیں کہ اس تصورِ فاسدہ کا شکار ہندو تو بنے ہی بنے مسلمان بھی بن گئے۔

اب انھونے ایک اور نیا کام کیا کہ نوکر شاہی کو انگریزی زبان کی بنیادوں اور برطانوی اُصولوں پر استوار کرنے کا فیصلہ کیا جس کئ لئے بتدریج اقدامات کئے گئے اول فارسی کی جگہ مقامی بولی اُردو کو بروئے کار لایا گیا ،یہ منشی فاضل وغیرہ اسی کی یادگار امتحانات ہیں جسے میں رائج مغلیہ اصول کو کسی حد تک برقرار رکھا گیا ،پھر جیسے جیسے اثر و نفوذ قایم ہوتا گیا ،حکومت خالص ہوتی گئی ویسے ویسے نظمیاتی ڈھانچہ بدلتا گیا۔

[11] **Author :Our Indian Muslim's.**

مسلمان بھی اس سماج مین راستہ بنانے لگے مگر حکومتی حکمت علمی صرف انکا خروج تھا لہذا فیصلہ ہوگیا کہ اب انگریزی ہی دفتری زبان ہوگی اور بعد میں اسکے ساتھ مقابلے کے امتحانات کو بھی رواج دیا گیا۔

اب مسلمان جو کل تک اپنی فارسی اردو کے سبب پڑھے لکھے جانے جاتے تھے اب چونکہ وہ خود بھی محکوم تھے ،انکی زبان کو خارجِ دفتر کردیا گیا تھا،انکا حصہ دفاتری سماج بھی مسلسل گھٹ رہا تھا،ان میں تابعداری کا مادہ کم تھا ،اُن سے وفاداری کی توقع کم تھی ۔جبھی انکی زبان کا خروج ِدفتر انکی جہالت کی علامت بن گیا ۔

ہندو اپنی لسانی ہم أغوشی اور مذہبی مفاھمت کے سبب نوکر شاہی میں حصہ بناتے گئے اور کل نوکر شاہی پر قابض ہوگیے۔

ہمارے رفیق جناب سید خالد جامعی صاحب کی یہ معرکتہ الأرا تحریر بروشسکی زبان کے تناظر میں زبانوں کے قتل عام کا احاطہ کرتی ہے اور اعداد و شمار،تاریخ اور فلسفہ کو بروئے کار لاکر معاملہ مذید مضبوط و مستحکم کیا گیا ہے تنقیدی نقطہ نظر سے موصوف نے تعلق بین العلوم و متن کے جدید طریقے بڑی خوبی سے بروئے کار لائے ہیں ۔

یہ تحریر اول شعبہ تصنیف و تالیف ،جامعہ کراچی کے علمی جریدہ :جریدہ : ۳۰ اور ماھنامہ ساحل،کراچی میں طبع ہوا تھا۔

اب أن لاین ایڈیشن کو ہم نئی أب و تاب ،تہذیب کے ساتھ ،جناب خالد جامعی کی اجازت و تعاون سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں۔

محمد علی جنید

ریسچ اسکالر،شعبہ سیاسیات

جامعہ کراچی

بروشسکی زبان: بعض اہم مباحث

استعمار کے ہاتھوں زبانوں کے قتلِ عام کی تاریخ

سیّد خالد جامعی رعمر حمید ہاشمی ☆

[اس مضمون میں بروشسکی زبان کی تاریخ کے چند اہم پہلوؤں کے ساتھ ساتھ برطانوی، امریکی، روسی، المانوی، ولندیزی، فرانسیسی، ہندو استعماری طاقتوں اوران کی نوآبادیات میں انسانوں اور زبانوں کے قتل عام کی تاریخ کا مختصر جائزہ بھی لیا گیا ہے اور مٹنے والی زبانوں کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔]

زبانوں کی تاریخ محض بھول بھلیوں میں گم ہوجانے اور مسلسل گم رہنے کی تاریخ ہے جس میں ہر لمحہ نئے موڑ آتے ہیں اور ہر لحظہ قدیم تحقیقات یکسر مسترد کردی جاتی ہیں۔ نئے قیاسات مفروضات قائم کیے جاتے ہیں اور نئے نظریات کے سہارے محقق کا سفر جاری رہتا ہے۔ زبانوں پر ایک زمانہ وہ بھی گزرا جب سنسکرت کو زبانوں کی ماں قرار دیا گیا اور بے شمار زبانوں کے رشتے اسی سے جوڑ دیے گئے حتیٰ کہ سنسکرت شمالی ہند کی تمام زبانوں کی ماں قرار دی گئی اور اردو زبان کو سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل کہا گیا لیکن مولانا ابوالجلال ندویؒ [۱، ۲، ۳] اور ڈاکٹر سہیل بخاری [۴] نے ام السنہ کے حوالے سے نت نئے انکشافات کیے، جس کے نتیجے میں ایک ہلچل پیدا ہوئی، یہ ہلچل ابھی علمی حلقوں میں تسلیم نہیں کی گئی مگر ان اہروں نے فکر و نظر کے بعض نئے دریچے روشن کیے۔ ان انکشافات کی بنیاد پر ڈاکٹر خالد حسن قادری نے ''اردو کا آغاز او رمولد'' کے عنوان سے بعض نئے خیالات پیش کیے [۵]۔

آریاؤں کی آمد پر لسانی نقشہ کیا تھا؟

اب تک تقریباً سبھی نامور علمائے لسانیات ہند کے خیال میں سنسکرت شمالی ہند کی تمام زبانوں کی ماں

☆ ناظم و نائب ناظم، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی

سمجھی جاتی ہے لیکن ایک سادہ سا سوال جو اکثر اس لیے نہیں پوچھا جاتا کہ اس کا نظر انداز کرنا آسان ہے لیکن اس کا جواب فراہم کرنا مشکل، کہ آریائی قوم نے جب ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس وقت ہندوستان کا لسانی نقشہ کیا تھا؟ کیا وہ لوگ جو شمالی ہند کے اس وسیع، زرخیز اور تہذیب یافتہ علاقے میں رہتے تھے اور حملہ آور آریاؤں کے ساتھ جن کا واسطہ پڑا کیا وہ گویائی سے محروم تھے یا ان کی کوئی زبان ہی نہیں تھی؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ کون سی زبان یا زبانیں تھیں جنھیں وہ استعمال کرتے تھے؟ ظاہر ہے آریاؤں کی آمد سے قبل ہندوستان کے لوگ گونگے بہرے نہیں تھے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے تو اس ضمن میں بہت بڑی زقند لگائی ہے اور قدیم ترین زبانوں میں اردو زبان کے الفاظ کو شامل دکھایا ہے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے۔

"سب سے پہلی بات یہ کہ اردو زبان کی قدامت کے موضوع پر بلکہ اردو لسانیات کے میدان میں کسی موضوع پر مرحوم ڈاکٹر سہیل بخاری کی کوئی بات معتبر نہیں۔ اور ان کا یہ ارشاد تو واقعی تعجب انگیز ہے کہ اردو کے الفاظ سنسکرت، ویدی سنسکرت اور رگ وید یا ژند میں موجود ہیں۔ یعنی ڈاکٹر صاحب کے خیال میں مندرجہ بالا زبانیں یا کتابیں اردو کے بعد یا اردو کے ساتھ ساتھ وجود میں آئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات غلط محض ہے۔ لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ کس لفظ یا الفاظ کو اردو کے لفظ قرار دیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اردو میں جو الفاظ غیر زبانوں سے لے لیے گئے ہیں وہ تو ان ہی زبانوں کے ہیں اردو کے نہیں ہیں۔ پھر ہزاروں الفاظ ایسے ہیں جو سنسکرت سے آئے ہیں اور اردو میں آتے آتے یا اردو میں آنے کے بعد ان کی شکل بدل دی گئی ہے۔ مثلاً سنسکرت میں دگدھ [Dugdh] ہے جو اردو میں دودھ ہو گیا اس طرح کے ہزاروں الفاظ ہیں جو اصلاً اردو نہیں ہیں۔ یہ جس زبان سے آئے ہیں وہ زبان اردو سے تقدم زمانی رکھتی ہے یا پھر اردو کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئی۔"[۶]

تاریخی افسانے:

خالد حسن قادری کے خیال میں "آریاؤں کے ورود کا سال ۱۵۰۰ ق م ہے ویدوں کا زمانہ تقریباً ایک ہزار سال پر محیط فرض کر لیا گیا ہے، آخری وید "اتھروید" کی تصنیف ۴۰۰ ق م کے آس پاس ہوئی، پہلی ویدی تخلیق ۱۴۰۰ ق م بتائی گئی۔ مگر یہ تمام تاریخیں واضح طور پر محض الل ٹپ نظریات ہیں۔ یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال تک یہ وید اور بالخصوص پہلے تین وید ضبط تحریر میں نہیں آئے اور رسم الخط کی ایجاد و دریافت سے پہلے تقریباً ایک ہزار سال کی مدت تک یہ تمام وید صرف زبانی اور سماعی روایات کے طور پر منتقل ہوتے رہے۔[۷]

سنسکرت اصلی نہیں رہی:

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ویدوں کی زبانوں نے مقامی زبانوں کا گہرا اثر قبول کیا تھا جس کی وجہ

آئے تھے، سنسکرت کے بہت سے ماہرین اب اس نقطۂ نظر پر متفق ہو چکے ہیں۔ ویدوں کی سنسکرت کے بہت سے اجزا ءاس کی ہم ماخذ یورپی زبانوں میں موجود نہیں۔ مثال کے طور پر زبان کے پچھلے حصے سے نکلنے والی آوازا ورالفاظ کی ایک کثیر تعداد جو کہ ویدوں کی سنسکرت میں تو موجود ہے لیکن یورپی شاخ کی دوسری آریائی زبانوں سے غائب ہے۔[۸] یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سنسکرت بغیر رسم الخط کے زبان تھی لہٰذا ایک ہزار سال تک محض زبانی روایات کے بل بوتے پر اس کا خالص رہنا محال صورت تھی۔

پانینی کی سنسکرت اصل سے مختلف ہے:

پانینی نے جب پشاور میں اپنی لافانی قواعد مرتب کرنا شروع کی تو جس زبان سے وہ واقف تھا وہ حملہ آور آریوں کی اصل زبان سے واقعی مختلف تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ پانینی کی سنسکرت بھی ویدوں کی سنسکرت سے بہت مختلف تھی۔ قواعد کی کچھ شکلیں ایسی بھی ہیں جو رگ وید میں تو ہیں مگر جدید سنسکرت میں ان کا وجود نہیں۔ اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سنسکرت کو خود تبدیلیوں کے بے شمار مراحل سے گزرنا پڑا ہے جس کا بالعموم اعتراف نہیں کیا جاتا۔[۹]

آریاؤں کا دیسی زبانوں سے رویہ:

چوں کہ آریہ مفتوح لوگوں کی زبان سمجھنے سے قاصر تھے لہٰذا انھوں نے مفتوحین کی زبانوں کو "وبھاشا" (غیر زبان) یا "اشور بھاشا" (بھوتوں کی زبان) یا پھر "ناگ وانی" (ناگ، سانپ اور ناگ قوم کی زبان) کہتے تھے۔ یہ سارے نام ایک بیرونی زبان کو ظاہر کرتے ہیں۔ لفظ بیرونی سے ان کی مراد ایک ایسی زبان تھی جو نا قابل فہم ہو، کیوں کہ ان کے نزدیک ان زبانوں میں نہ کوئی ربط تھا نہ منطق اور نہ قابل فہم قواعد۔ اسی وجہ سے ان زبانوں کو "غیر زبان" (یعنی کوئی زبان نہیں) کا درجہ دیا گیا۔ جیسا کہ ہر مادری زبان بولنے والے کو اپنی زبان معقول، مدوّن اور منظم لگتی ہے، کانوں میں شیرینی گھولتی ہے، اس وجہ سے آریہ بھی اپنی زبان کو خالص، تہذیب یافتہ زبان "سانسکرت" اور، دیوتاؤں اور دیویوں کی زبان "دیاوانی" (دیوابانی) کہتے تھے۔[۱۰]

اردو ہندی؛ ہند آریائی زبانیں نہیں:

ڈاکٹر خالد حسن قادری نے اس مفروضے کو رد کرتے ہوئے کہ تمام ہند آریائی زبانیں سنسکرت سے نکلی ہیں، لکھا ہے "اوّلاً مجھے ببانگ دہل یہ کہنا ہے کہ تمام زبانیں سنسکرت سے نہیں نکلی ہیں۔ اُردو اور اس کے ساتھ ہندی اپنے وجود کے لیے سنسکرت کی مطلق محتاج نہیں اور جن معنوں میں ہند آریائی زبانوں کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، ان معنوں میں اردو اور ہندی ہند آریائی زبانیں بھی نہیں کہی جاسکتیں۔ نیز یہی نظریہ دوسری

ہندوستانی زبانوں کا بھی احاطہ کرسکتا ہے جن کی اب تک بغیر حیل وحجت ہند آریائی زبان کے ساتھ گروہ بندی کی جاتی تھی۔"[۱۱]ڈاکٹر خالد حسن قادری کا یہ نظریہ نیا نہیں مولانا ابوالجلال ندویؒ اپنے بے شمار مضامین میں اس موضوع پر تحقیقی نکات پیش کر چکے ہیں، ان کے مضامین ماہِ نو اور بعض غیر مطبوعہ مضامین شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی کے تحقیقی مجلّے "جریدہ" شمارہ ۲۲، ۲۳، ۲۴ میں شائع ہو چکے ہیں۔

سنسکرت جیسی زبان کا حشر علماء لسانیات کے ہاتھوں کیا سے کیا ہو گیا تو دوسری زبانیں کیا حیثیت رکھتی ہیں اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس صورت حال میں بروشسکی جیسی غریب، اجنبی، نامانوس زبان پر کچھ لکھنا، کچھ کہنا بہت مشکل کام ہے لیکن بروشسکی اکادمی کے ذمہ داروں کا حکم ہے کہ اس موضوع پر کچھ ضرور لکھا جائے۔ اس زبان پر کچھ لکھنے سے قبل وادیٔ ہنزہ، اس کی تاریخ، روایات، تہذیب و تمدن، مذہب، ثقافت اور ادب کا اجمالی تذکرہ ضروری ہے۔

ہنزہ، محلِ وقوع:

ریاست ہنزہ کوہستان قراقرم کے اونچے پہاڑوں کے درمیان ایک وادی ہے۔ یہ وادی شرقاً غرباً ایک سو میل سے کچھ زیادہ لمبی اور شمالاً جنوباً نصف سے لے کر دو میل تک چوڑی ہے۔ اس کے مشرق میں چینی ترکستان (ائی غر یا سنکیانگ) کی حدود یارقند، سریقول اور کاشغر ہیں۔ جنوب میں ریاستہائے نگر، استور اور کشمیر واقع ہیں۔ جنوب مشرق میں بلتستان اور لداخ کے علاقے ہیں۔ شمال میں پامیر بیضائی گنبد، تاشقند اور افغانستان کے پامیر منارہ اور روخان ہیں اور مغرب میں اشلوکن اور روخان افغانستان کے علاقے واقع ہیں۔

ریاست ہنزہ کے باشندے تاتاری مغول، تاتاری ہن، بلتستانی بلتی، وخانی وخی اور قندوزی، بدخشانی، کرغز، داریل، تانگیر کی شین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ بروشسکی زبان بولنے کی وجہ سے سب بروشو (Burusho) کہلاتے ہیں۔[۱۲]

بروشو کون ہیں؟

بروشو دراصل "ہون" قبیلے کی ایک شاخ ہے جو چین میں دریائے ہوانگ ہو کے شمالی اور مغربی علاقوں میں بستے تھے۔ یہ آبادکار سفر کرتے ہوئے ہنگری میں آباد ہوئے اور ان ہی بے شمار حملہ آوروں میں سے کچھ لوگ موجودہ قراقرم، ہندوکش، اور ہمالیائی علاقوں میں بھی آباد ہو گئے۔ "ہونزہ" اصل میں "ہون زاد" تھا۔ نیز آبادی کا نام "ہنوکشل" اور اشخاص کے ناموں میں "ہنو" جیسا ایک نام اس حقیقت کی مزید تصدیق کرتا ہے۔ ہنگری کے پروفیسر آتمر اولا اور نصیر ہونزائی صاحب کے درمیان ہونے والی خط و کتابت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ دونوں قوموں کے لوگوں کے ناموں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔[۱۳]

بروشسکی کہاں بولی جاتی ہے؟

اِس وقت یہ زبان پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی وادیٔ ہونزہ، نگر اور یاسین میں بولی جاتی ہے، جب کہ گلگت کے گردونواح میں بھی بروشسکی بولنے والے افراد موجود ہیں۔ پاکستان کے جنوبی شہر کراچی میں بھی بروشسکی زبان بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ مجموعی طور پر پاکستان میں بروشسکی بولنے والوں کی تعداد تیس ہزار ہے لیکن بروشسکی اکادمی کے دعوے کے مطابق یہ تعداد تقریباً دو لاکھ ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں حتمی رائے دینا ممکن نہیں، وادیٔ ہونزہ، نگر اور یاسین کی بروشسکی بنیادی طور پر ایک ہی زبان ہے، تاہم تینوں علاقوں میں لہجے اور کچھ الفاظ کا فرق ہے، جس کی بنیادی وجہ جغرافیائی فاصلہ اور مختلف لسانی ماحول ہو سکتا ہے۔ [۱۴]

ہنزہ: طبقاتی تقسیم:

[۱] وادی ہنزہ کا حکمران طبقہ وہ تھا جو سابق میر کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا یہ خاندان تقریباً پانچ سو سال سے ہنزہ پر حکمران چلا آتا تھا۔ اب یہ امارت ختم کر دی گئی لیکن ماضی میں امیر کے ساتھ مختلف طبقات قائم تھے جن سے اس ریاست کی سیاست کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ [۲] دوسرا طبقہ وزراء کا ہے۔ [۳] تیسرا طبقہ اکابرین ملک کہلاتا ہے۔ یہ اکابرین ریاست کی ترقی اور فلاح و بہبود کے کاموں میں مشورے دیتے ہیں۔ بروشسکی میں اس طبقے کو کرپاتنگ (Kurpating) کہتے ہیں۔ [۴] چوتھا طبقہ بار (Bar) کہلاتا تھا۔ انھیں مدت سے عسکری فرائض سونپے گئے تھے۔ راستے محفوظ ہو جانے کے بعد اس طبقے کی ضرورت نہیں رہی۔ [۵] پانچواں طبقہ شدرشو (Sadarsho) کہلاتا ہے۔ اس طبقے کے لوگ سپاہ گری کی خدمت کے علاوہ حکمران طبقے کے لوگوں کی کاریگاری، جسے یہ لوگ رجاکی (Rajaki) کہتے ہیں، بھی کرتے تھے، جو اب قریباً ختم ہو گئی ہے۔ [۶] چھٹا طبقہ باربرداروں پر مشتمل تھا۔ ان کا کام بوجھ اٹھانا، طلاکشی کرنا اور بڑے زمینداروں کی خدمت بجا لانا تھا۔ میر محمد جمال خان صاحب کے عہد میں یہ طبقہ بالکل مفقود ہو گیا۔ [۷] ساتویں طبقہ میں ایسے مجرم مرد اور عورتیں آتی تھیں جن کو ناقابلِ معافی جرم کی پاداش میں قید کی سزا دی جاتی۔ ان کو غلام تصور کیا جاتا تھا اور یہ لوگ تھانگم (Thangum) کہلاتے۔ ان سے شاہی قلعہ میں آب کشی، جاروب کشی، ہیزم کشی اور گاؤبانی کی خدمات لی جاتیں۔ انگریزی تسلط کی ابتدا سے اس رواج کا انسداد ہونے لگا اور آخر میں غزان خان کے زمانے میں یہ رواج مکمل طور پر نابود ہو گیا۔ [۸] آٹھویں طبقے میں ہنرمند لوگ آتے ہیں۔ ان کو بروشسکی میں بریچو (Bricho) کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک نسل سے تعلق نہیں رکھتے ان میں کوئی بلتی ہے، تو کوئی وخانی اور کوئی شین نسل سے ہے۔ البتہ یہ لوگ ایک ہی گاؤں میں رہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں طبقاتی طور پر سب سے نچلے درجے میں آتے تھے اس لیے کہ یہ لوگ مروجہ اصولوں کے مطابق حلال و حرام کے تصور کا احترام نہیں کرتے تھے اور بیویوں کو بلا مہر و طلاق

رکھ لیتے اور چھوڑ دیتے تھے۔ اب یہ لوگ اپنے روحانی پیشوا حاضر امام کی پیروی کی بدولت مومن کہلاتے ہیں او ران کے گاؤں کو بریشل (Berishal) یعنی مومن آباد کہا جاتا ہے۔[۱۵]

لباس کا انداز:

میر محمد نظیم خان (۱۸۹۲ء۔۱۹۳۸ء) کے عہد کی بے ڈول ٹوپیاں بوڑھی عورتیں پہنا کرتی ہیں۔ ان کے دور میں مذہبی اثرات کے زیر اثر جسم کی مکمل ستر پوشی کے لیے گلے اور آستینوں والا کُرتا پہنا جانے لگا جسے خراسانی یا درویشانہ کُرتا کہا جاتا تھا۔[۱۶]

عہدے اور مناصب:

ریاست ہنزہ کے قدیم مناصب کا جاننا بھی ضروری ہے جس سے ہنزہ کی تہذیب و ثقافت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ریاست ہنزہ میں عہد قدیم سے مندرجہ بالا عہدے پائے جاتے تھے۔

۱۔ فراش معروف بہ فراج، ۲۔ برق، ۳۔ دیوان بیگی، ۴۔ وکیل، ۵۔ ایلچی، ۶۔ ٹیلپانچی، ۷۔ بیپا، ۸ محرم، ۹۔ بساول، ۱۰۔ غول چیس یا گل چیس، ۱۱۔ اسیری، ۱۲۔ میر شکار، ۱۳۔ شبانی۔

تہوار:

ریاستی لوگوں کے تہوار بھی اہمیت کے حامل ہیں جس سے تاریخ کا سفر آسان ہو جاتا ہے، اہم تہوار آٹھ ہیں جھوشلنگ، گرو کس، بوفو، نوروز، شکامشنگ، گنانی، بیاقمر اور دھوم نکھالی۔[۱۷]

مذہبی پس منظر:

ہنزا کے لوگ بتوں کو حاجت روا اور نجات دہندہ سمجھتے تھے، ان کے نام پر نذرانے پیش کرتے تھے اور اپنے مُردوں کو جلاتے تھے۔ مُردوں کو جلانے کے مقامات کے نام جنھیں بروشسکی میں جائی میچنگ (Jeymicing) کہتے ہیں اب بھی موجود ہے۔

ہنزہ میں جن بتوں کی پوجا ہوتی تھی ان کے نام یہ ہیں: سہلا بوئن (Sahala Boyn)، ہلا بوئن (Hala Boyn) اور تھول بوئن (Thol Boyn)۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ایسے جانوروں کی پرستش بھی کرتے تھے جن کو بویو (Boyo) کہا جاتا۔ بویو ایک غیر پالتو جانور تھا جو کتے کے پلے سے بہت مشابہت رکھتا تھا۔

اسماعیلی علماء، تبلیغی کوششیں:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کے غلبہ پالینے کے باوجود اسلام کی تبلیغ کا کام بہت بعد میں شروع ہوا۔ کیوں کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے تک اس علاقے میں قرآن کریم نہیں پہنچا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شاہ بیگ

کا بیٹا خسرو خان مذکورہ سن میں تخت نشین ہوا تو اس وقت قرآن کریم کا ایک نسخہ یہاں لایا گیا۔ چونکہ انیسویں صدی کے آخر تک کوئی تعلیمی بندوبست نہیں تھا اس لیے لوگ اسلامی عقائد اور نظام فکر سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب کے اثرات ختم ہو جانے کے باوجود یہاں کئی معمر لوگوں کے نام سکھی یا ہندوانہ ہیں۔

تبلیغ کے سلسلہ میں جو علماء یہاں تشریف لائے ان میں اکثریت اسماعیلی فرقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج یہاں کی قریباً تمام آبادی اسماعیلی عقائد ہی کی پیرو ہے۔[۱۸]

گرمنس اور غتنس [لکھنا پڑھنا]

بروشسکی زبان محض ایک بولی تصور کی جاتی ہے اور بظاہر اس میں لکھنے اور پڑھنے کا رواج نہیں تھا کیوں کہ قدیم کتبات مخطوطات اور کتابوں کا سراغ نہیں مل سکا لہٰذا اس زبان میں کوئی قدیم ادبی مواد موجود نہیں ہے لیکن اس زبان کے دو قدیم مصادر گرمنس (girmina s) یعنی لکھنا اور غتنس (gatanas) یعنی پڑھنا یہ ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ کسی دور میں یقیناً بروشسکی زبان لکھی اور پڑھی جاتی تھی۔

بروشسکی: لسانیاتی نقطۂ نظر سے:

برعظیم کی زبانوں کے مبسوط جائزے میں گریرسن نے جو کچھ اپنی ابتدائی رائے دی تھی اس پر بہت زیادہ نئی معلومات تا حال اس کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ کرنے والوں کو نہ مل سکیں۔ لیکن پروفیسر شاہین نے شمالی علاقہ جات میں بعض ایسی زبانوں کو دریافت کیا ہے جن کا ذکر گریرسن کے یہاں نہیں ملتا ان میں کچھ زبانیں ایسی ہیں جن کے بولنے والے اب صرف چند رہ گئے ہیں پروفیسر شاہین افغانستان کی وادی کنٹر کو زبانوں کی وادی قرار دیتے ہیں جہاں بے شمار زبانیں اپنے اصلی لب و لہجے کے ساتھ زندہ ہیں حتیٰ کہ سنسکرت زبان بھی۔[۱۹]

بروشسکی زبان کے تحقیقی اور سائنٹیفک اصولوں کے مطالعہ کی تاریخ میں لوری مر Lorimer کی کوششوں کو اولین سنگ میل سمجھنا چاہیے جن کے بارے میں جارج مورگن اسٹیرن George Morgenstierne نے ۱۹۳۲ء میں اپنی روداد برائے Mission of North West India 1932 -0520 (مطبوعہ اوسلو، ۱۹۳۲ء) میں یہ اطلاع دی تھی کہ لوری مر نے بروشسکی کے مطالعے میں خاصی پیش رفت کی ہے۔[۲۰] مگر اس زبان کی اصل و بنیاد کا مطالعہ بے حد مشکل ثابت ہوا ہے۔ خود جارج نے اس کی صوتیات کا مطالعہ اس کی پڑوسی ہند ایرانی زبانوں سے تقابل کے ساتھ کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہرمن برگر Hermann Berger نے اپنے مطالعات کے ذیل میں، جو اس نے ہائیڈل برگ کے ''ادارہ مطالعات شرقیہ'' میں انجام دیے، بروشسکی سے ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۱ء کے عرصے میں دو کہانیوں کے ترجموں نے انقلابی نتائج

کی جانب ماہرین کی پیش قدمی کو آسان بنادیا۔اب وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ زبان اس علاقے میں اپنی پڑوسی زبانوں میں سب سے مختلف زبان ہے اوراس کی مماثلت کسی اورزبان میں نظر نہیں آتی۔یہاں تک کہ تبتی زبانوں میں ، بلکہ نہایت قریبی زبان بلتی سے بھی کوئی مماثلت نہیں رکھتی ۔ محض ایک ہلکی سی مماثلت قفقازی (Caucasian) زبانوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔اسی فاضل مترجم اور ماہر لسانیات برگر نے بالآخر اپنے مطالعات کی بنیاد پر ۱۹۷۴ء میں اس کی قواعد شائع کرڈالی۔[۲۱]

بروشسکی زبان دنیا کی چند عجیب وغریب اورانتہائی قدیم زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ ماہرین لسانیات ابھی تک اس زبان کے اصلی وطن یا دنیا کی اہم زبانوں سے اس کے رشتوں کی تلاش میں کامیاب نہیں ہوسکے۔یہی وجہ ہے کہ اس کو زبانوں کی درجہ بندی کی فہرست میں غیر نوعی زبان(Unclassified) قرار دے کر علیحدہ رکھا گیا ہے ۔[۲۲]

اس زبان پر اردو، ترکی، سنسکرت اور فارسی کے اثرات پائے گئے ہیں جب کہ عربی عبرانی مصادر بھی اس زبان میں پائے جاتے ہیں۔اور عصر حاضر میں شینا زبان سے جغرافیائی قربت کے باعث اس کے الفاظ اور بے شمار اردو اور انگریزی الفاظ بھی اس زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔

بروشسکی قواعد کے اصول:

قواعد کے اصول اور لفظوں کی بناوٹ کے اعتبار سے بھی یہ ایک دقیق اور پیچیدہ زبان ہے جس میں تذکیر وتانیث کے چار اجزاء اور واحد سے جمع بنانے کے پچاس سے زائد اصول ہیں۔یہ زبان، جواب تک صرف ایک بولی کے طور پر پہچانی جاتی ہے، تحریر کے دور میں داخل ہوچکی ہے۔اس وقت یہ زبان مشرق میں عربی/اردو رسم الخط اور مغرب میں رومن رسم الخط میں لکھی جارہی ہے۔عربی/اردو رسم الخط میں پاکستان سے بروشسکی میں اب تک آٹھ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔اس رسم الخط میں پہلی کتاب ۱۹۷۰ء میں پاکستان سے شائع ہوئی۔انگریزی، جرمن و دیگر زبانوں میں بروشسکی زبان سے متعلق تقریباً نو کتابیں غیر ملکی ماہرین تحریر کرچکے ہیں۔اس طرح بروشسکی زبان میں اور بروشسکی زبان سے متعلق مطبوعہ کتابوں کی کل تعداد سترہ سے زیادہ نہیں۔لیکن یہ تعداد نہایت حوصلہ بخش ہے۔مختصر عرصے میں ایک بولی دو رسم الخط اختیار کرکے کتابوں کے سانچے میں ڈھل گئی ہے۔[۲۳]

نفیس، شائستہ اور نستعلیق زبان:

تاریخ کے کسی عہد میں یقیناً بروشسکی ایک نہایت غیر معمولی زرخیز اور اہم علمی وادبی زبان رہی ہوگی۔اس کی زرخیزی آج بھی تروتازہ ہے۔المیہ یہ ہے کہ اس زبان کا کوئی مخطوطہ یا تحریری نمونہ تاحال دستیاب نہ

ہو سکا لیکن اس زبان کی گہرائی و گیرائی کا اعتراف لازمی ہے۔ مثال کے طور پر دروازہ کھولنے کے تین مختلف طریقوں کو یہ زبان نہایت خوبصورتی، نفاست اور نستعلیق انداز سے اس طرح بیان کرتی ہے:

[redacted] قریک بہت ہی آہستہ سے دروازہ کھولنے کی آواز۔

[redacted] قراک زور سے دروازہ کھولنے کی آواز۔

[redacted] قُرک بہت زیادہ تیزی سے دروازہ کھولنے کی آواز۔

زبان میں ایسی نفاست کہ لفظوں سے عامل کی ذہنی حالت، اخلاقی کیفیت اور نفسی خلل کا اندازہ کیا جا سکے۔ یہ خاصیت انگریزی، اردو، عربی، فارسی، ہسپانوی اور فرانسیسی میں بھی موجود نہیں اور ان تین مختلف کیفیات کے لیے ہمیں ان زبانوں میں کوئی جامع لفظ نہیں ملتا۔[۲۴]

بروشسکی زبان کی یہی فصاحت و بلاغت اس امکان کا در وا کرتی ہے کہ یہ زبان کبھی اہم علمی و ادبی زبان بھی رہی ہوگی۔ اس کی تصدیق بروشسکی زبان کے دو قدیم مصادر گرمنس (Girminas) لکھنا اور غتنس (G atanas) پڑھنا سے ہوتی ہے۔ یہ دونوں مصادر اس امکان کو یقین میں بدلنے کے لیے کافی ہیں کہ بروشسکی زبان کبھی لکھی اور پڑھی جاتی تھی اور تاریخ کے کسی دور میں یہ صفحۂ قرطاس پر تحریر بھی کی جاتی رہی مگر اس کا رسم الخط کیا تھا یہ کوئی نہیں جانتا۔ اس زبان کا ادب، شاعری، تاریخ اور ثقافتی ورثہ تحریری حالت میں دستیاب نہیں۔

بروشسکی: عربی، عبرانی روابط:

اس زبان میں عربی اور عبرانی مصادر کے باوجود اس زبان کا اسلوب، ساختیات، صوتی نظام، قواعد عربی یا عبرانی زبانوں سے اس قدر مختلف ہیں کہ اسے سامی زبانوں کے گروہ میں شامل نہیں کیا گیا۔

"ئیل کنس" عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ "ئیل" عبرانی میں خدا کو کہتے ہیں، جیسے جبرائیل کے معنی ہیں مرد خدا یا بندۂ خدا۔ بروشسکی زبان میں اس سے مماثل لفظ ئیلکنس (ایلکنس) ہے جس کے معنی عبادت و پرستش کے ہیں۔ عربی زبان میں "حَیَّ وحَیَّ ھلاً وَحیَّھلَ" اسم فعل بمعنی جلدی کرو متوجہ ہو کے لیے آتا ہے، جس طرح اذان میں حی علی الفلاح (دوڑو فلاح کی طرف) کہا جاتا ہے اسی طرح بروشو زبان میں حَیَّ اے[۲] (جلدی کر) کا لفظ مستعمل ہے۔ عربی زبان میں "ھلال" کے معنی ہیں نیا چاند جب کہ بروشسکی میں یہ لفظ من و عن کنواری، دوشیزہ، بن بیاہی لڑکی کے لیے بولا جاتا ہے۔ ہلال بروشسکی میں لفظ بھی ہے اور تشبیہ بھی۔

"فخر" ایک قدیم عربی لفظ ہے جس سے بروشسکی لفظ ڈفو غُرس بنا ہے۔[۲۵]

بروشسکی فرانسیسی گنتی میں مماثلت:

ماہرین لسانیات کے لیے یہ بات نہایت تعجب خیز ہوگی کہ بروشسکی کی گنتی فرانسیسی زبان کی گنتی سے مکمل مشابہت اور مماثلت رکھتی ہے جب کہ بروشسکی کے حروف تہجی، تلفظ، اور ذخیرۂ الفاظ میں فرانسیسی اثرات کا سراغ ابھی تک نہیں مل سکا۔ گنتی کے اظہار کا بروشسکی طریقہ فرانسیسی طریقے سے مکمل مطابقت رکھتا ہے۔ایسا کیوں ہے؟ابھی کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔

مثال کے طور پر ۹۹۹ کو بروشسکی اور فرانسیسی دونوں زبانوں میں ایک ہی طریقے سے ادا کیا جاتا ہے۔فرانسیسی میں کہا جائے گا Neuf Cent Quatre Vingt Dix-neuf

(9 hundred + 4 X 20 + 10 + 9)

اس کا مطلب یہ ہے کہ نوسو جمع چار ضرب بیس جمع دس جمع نو

بروشسکی میں

ہُنتی تھ کے۲ ولتی آلتر تورمہ ہُنتی

۹سو + ۴ x ۲۰ + ۱۰ + ۹

اس کا مطلب یہ ہے نوسو جمع چار ضرب بیس جمع دس جمع نو

کیا فرانسیسی اور بروشسکی گنتی کے اصول وضوابط میں مکمل مشابہت عربی سنسکرت میں موجود قواعد اسم میں پائی جانے والی مماثلت کی طرح محض اتفاقی ہے یا حادثاتی ؟اس پر تحقیق کی ضرورت ہے۔[۲۶]

سو فیصد خواندگی کا اشارہ:

فرانسیسی اور بروشسکی گنتی کے منفرد اصول ان دونوں قوموں میں سو فی صد خواندگی اور تعلیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔صرف یہی نہیں بلکہ گنتی(Counting) کے یہ اصول ان دونوں قوموں کی ذہنی بالیدگی کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔بروشسکی اور فرانسیسی میں گنتی سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ بولنے والے اور سننے والے کو پہاڑے(Tables) حفظ ہوں اور ریاضی کے بنیادی اصول معلوم ہوں تاکہ وہ اعداد کو ضرب دے کر جواب معلوم کر سکے یا موقف سمجھ سکے۔ گنتی کے اظہار کا یہ طریقہ نہایت پیچیدہ ہے اور اس طریقے میں ذہن کو ہمہ وقت حاضر رکھنا اور درست طریقے سے نتائج نکالنا ضروری ہے اور اس کے لیے معقول حد تک ذہانت بھی درکار ہے۔ اس اصول سے یہ بات واضح ہے کہ ان دونوں قوموں کے تمام لوگ یقیناً پڑھے لکھے تھے اور خواندگی کی سطح سے بلند تر تھے اور دوسری قوموں کی نسبت زیادہ ذہین بھی تھے۔اس کے بغیر حساب کتاب کا اتنا پیچیدہ نظام اختیار کرنا ممکن نہیں۔اس تناظر میں دونوں قوموں کی تاریخی ذہانت کا تجزیہ محققین کے لیے تحقیق کے نئے دروازے کھول سکتا ہے۔

بروشسکی اور جاپانی میں مماثلت:

بروشسکی زبان میں انسان، جانور، غیر جاندار اشیاء اور اشیاء کی مقدار کے لیے گنتی کے طریقے مختلف ہیں مثلاً:

ہسن، ایک آدمی اور ہَسن، ایک جانور کے لیے ہے جبکہ ہک ایک دفعہ، اور اشیاء کی مقدار ناپنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر جاپانی زبان بھی اسی اسلوب کی حامل ہے۔

اردو زبان میں زیروزبر کے فرق سے لفظوں کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ مثلاً

گئے چار سَن، ترا کم تھا سِن کہ لیے تھے سُن ترے گھنگھرو

ہوا سینہ چُھن گیا دل بھی چِھن جونہی بولے چَھن ترے گھنگھرو

لیکن زیروزبر سے پیدا ہونے والا یہ فرق اردو گنتی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اردو میں ایک جانور، ایک انسان، ایک پیالی اور ایک سیر کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے اعراب کے ذریعے آوازیں تبدیل نہیں کی جاتیں۔ اس کے برعکس جاپانی زبان میں بروشسکی کی طرح زیروزبر سے گنتی کا مفہوم تبدیل ہو جاتا ہے اور مختلف اشیاء کے لیے مختلف الفاظ بھی بولے جاتے ہیں۔ جاپانی زبان میں حفظ مراتب کا بھی خیال رکھا جاتا ہے اور گفتگو میں لفظوں کے استعمال سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جس کے بارے میں گفتگو کی جا رہی ہے اس کا سن و سال کیا ہے۔[۲۷]

زیر زبر کے فرق سے گنتی کے جاپانی اور بروشسکی طریقے میں یہ مماثلت کیا محض اتفاقی ہے، جس طرح عربی اور سنسکرت میں اسم کے اظہار کا طریقہ یکساں ہے اور جس طرح بروشسکی اور فرانسیسی میں گنتی کا طریقہ ایک ہے؟ اس موضوع پر مناسب تحقیق کی ضرورت ہے۔

بروشسکی اور ہنگری میں مشابہت:

قدیم ہنگری باشندوں اور قدیم بروشو افراد کے ناموں میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ مگر کیا یہ مماثلت ذخیرۂ الفاظ یا تلفظ میں بھی موجود ہے؟ اس سلسلے میں ہنگری کے پروفیسر آنجرا ولا کام کر رہے ہیں۔ ہنگری زبان جرمنک (Germanic) اور اورال التائی (Ural-Altaic) گروہ سے رابطہ رکھتی ہے۔ بعض ماہرین کے مطابق یہ زبان فرانسیسی اور جرمن زبانوں کے گہرے اثرات کے باعث قدیم ذخیرۂ الفاظ کھو چکی ہے اور اس کا بنیادی سانچہ اپنی اصل پر قائم نہیں رہا۔ لہٰذا بروشسکی اور ہنگری زبان میں مطابقت کی تلاش ایک کٹھن کام ہے۔ بروشسکی اور ہنگری میں مطابقت تلاش کرنے کے لیے قدیم ہنگری زبان کے مخطوطات پڑھ کر اس کے ذخیرۂ الفاظ میں عہد بہ عہد آنے والی تبدیلیوں کا تجزیہ کر کے ہی کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

بروشسکی زبان اور ماہرین لسانیات:

Grierson کے خیال میں:

''بروشسکی چوتھے گروہ کی واحد نمائندہ زبان ہے۔ جس کے کسی سے الحاق کا اب تک پتہ نہیں ہے۔ اس زبان کو پاکستان کے انتہائی شمال میں واقع گلگت ہنزا یعنی دریائے سندھ کے دو بالائی متوازی دریاؤں کے بیچ کی وادیوں میں ۳۰ ہزار افراد دو لہجوں میں بولتے ہیں۔

اس زبان کی ابتدائی نشوونما کے بارے میں آراء میں اختلاف ہے۔ اس کے بولنے والوں میں دنیا کے چند چنندہ کوہ پیما بھی ہیں۔ ان لوگوں کی عمریں بھی کافی طویل ہوتی ہیں۔

برو (Burrow)(۱۹۵۴:۳۷۵ء) کہتے ہیں کہ یہ غالباً ہمیشہ سے ایک دور دراز کے پہاڑی راستے میں ایک محصور کائی رہی ہوگی، اور شاید آج سے زیادہ بڑے علاقے پر پھیلی ہوئی بھی ہو۔[۲۸]

Colin P. Masica نے بتایا ہے کہ:

''جب کہ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ ایسے دروں میں یعنی انتہائی بالائی وادیٔ سندھ بشمول نورستان میں پھیلی ہوئی ہوگی جہاں آج دارد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بروشسکی سے داخل ہونے والے الفاظ بھی ان میں سے کچھ زبانوں میں ملتے ہیں مثلاً ''زاکن'' یعنی ''گدھی''۔

دراس کی شینا میں ''پُھو'' یعنی آگ۔ پراسُن میں ''مئیل'' یعنی پیٹ، اور حیرت انگیز طور پر ''لوہے'' کے لیے بروشکی زبان کا لفظ ''چھومَر'' جو کہ کتی، وائیگالی، کلاشا، کھوار، گوار بتی، پشائے، گوری، توروالی اور شینا زبانوں میں مستعمل ہے۔ یہاں اس بات کو بھی دھیان میں رکھنا چاہیے کہ نہ صرف دراوڑی اور منڈا زبانیں، بلکہ تبتی۔ برمی اور بروشسکی میں بھی قواعد کی خصوصیات یکساں نوعیت کی ہیں جو کہ بعد کی ہند آریائی زبانیں ہیں۔ موخرالذکر کی سب سے واضح خاصیت ان کے فاعل کی مجہولی حالت ہے''۔[۲۹]

David Crystal کی انسائیکلوپیڈیک ڈکشنری آف لینگویج اینڈ لینگویجز کے مطابق:

''شمال مغربی کشمیر، بھارت اور پاکستان کے کچھ حصوں میں بولی جانے والی ایک محصور زبان، تقریباً ۴۰ ہزار افراد بروشو قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ زبان بولتے ہیں اس کا کوئی رسم الخط نہیں ہے''۔[۳۰]

زبانوں کے تعارف پر مشتمل آکسفورڈ پریس کی مشہور کتاب کے مصنف Anatole V. Lyovin نے بروشسکی پر جو تحقیقات کی ہیں اس کے نتائج درج ذیل ہیں:

''بروشسکی ایک محصور زبان ہے جسے تقریباً (ہنزہ اور نگر کے علاقوں میں) ۴۰ ہزار افراد بولتے ہیں۔ یہ زبان دارد اایرانی (ہند یوروپی) اور تبتی (چینی۔ تبتی) زبان بولنے والوں کے درمیان گھری ہوئی ہے،

لیکن اس کا علاقہ بہت دور اور گھرا ہوا ہے اور اس کا لسانی تعلق بنیادی طور پر داردزبانوں خاص کر شینا سے ہے۔

بنیادی طور پر قفقازی کی زبانوں، اور کچھ دوسری زبانوں سے اس کی صنفی مماثلت کی بنیاد پر روابط ابھی تک مستند نہیں ہیں۔

یہ مانا جاتا ہے کہ کبھی ان علاقوں کے دارد زبانیں بولنے والے لا ایسی زبان بولتے تھے جو کہ بروشسکی کے مماثل رہی ہوگی۔ یہ ایک فاعلی مجہول زبان ہے، جس میں SOV کا لفظی نظام ہے۔ اس کے علم الاصوات سے متعلق فہرست کافی حد تک اس کی پڑوسی، ہند آریائی اور دارد زبانوں سے مماثل ہے (سوائے سانس لیتے ہوئے پیدا ہونے والی آواز میں رکاوٹ والے الفاظ کے) اور اس میں چھوٹی زبان کی رکاوٹ اور صفیری الفاظ (حروفِ صحیح جو منہ کم کھلا ہونے کی حالت میں سانس کی رگڑ سے ادا ہوتے ہیں) کی بہتات ہے، جو دوسری ہند آریائی زبانوں میں نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں تین مختلف آوازیں ہیں۔

بروشسکی کے تمام اسم چار مستحکم معنویات کے درجوں میں منقسم ہیں:۔

۱۔ درجہ اسم برائے مذکر

۲۔ درجہ اسم برائے مؤنث

۳۔ درجہ اسم برائے جانور اور غیر انسان اور کچھ اشیاء مثلاً پھل، درخت کے حصے اور لکڑی سے بنی چیزیں اور کچھ قدرتی ماحول خاص کر فلکیاتی اجسام جیسے چاند وغیرہ۔

۴۔ درجہ اسم برائے غیر حیاتی چیزیں۔

یہ تمام درجات فعل کی ساخت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، جہاں سابقے تیسرے شخص فاعل کے ساتھ درجہ متصل بتاتے ہیں جبکہ لاحقے بھی یہی بتاتے ہیں مگر بالواسطہ اور بلاواسطہ مفعول کے ساتھ۔ یہی ایک یادگار عمل ہے جو قفقازی کی نارخ۔ داغستانی زبانوں سے مماثل ہے اور عموماً اسی بات کو اپنے قیاس کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے کہ بروشسکی نوعی طور پر ان ہی قفقازی زبانوں سے متعلق ہے۔ دوسرا ایک اور دلچسپ پہلو بروشسکی کا یہ ہے کہ اسم حالتِ اضافی لاحقوں کے طور پر بھی ہوتے ہیں۔ یہ وہ اسم ہیں جنھیں انسانوں اور جانوروں کا نا قابلِ تقسیم تصرف سمجھا جاتا ہے۔ اس میں جسم کے اعضاء، وہ چیزیں جو اسم کے نام ہیں، وہ اسم جو کچھ خاص جذبات کی طرف اشارہ کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس میں کچھ مختلف اشیاء بھی شامل ہیں، جیسے "چھڑی" اور "تکیہ"۔[۳۱]

بروشسکی زبان کی پیدائش کے متعلق قطعی طور پر کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی اس لیے کہ ماہرین لسانیات اس زبان کے بارے میں ہماری کوئی مدد نہیں کرتے۔ ماہر لسانیات کی تحقیقات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ ''بروشسکی زبان بولنے والے ایک وقت میں دردا خاندان کی زبانوں کے قریباً تمام علاقے یا پھر اس کے بڑے حصے پر قابض تھے''۔ [گریرسن]

۲۔ ''ہنزہ اور نگر میں دو مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں''۔ [گریرسن]

۳۔ ''ہنزہ اور نگر میں بولی جانے والی دونوں زبانیں ایک دوسری کے مماثل ہیں''۔ [لائٹنر]

۴۔ ''نگر کے لوگ اپنی زبان کو 'ششکند' کہتے ہیں''۔ [مسٹر کونوے]

۵۔ ''ایک زبان جو کبھی بہت بڑے حصے پر حاوی تھی آہستہ آہستہ چھوٹے سے چھوٹے حصے میں محدود ہو گئی اور ایسی جگہ پناہ لینے پر مجبور کر دی گئی جہاں اس پر دوسری زبانوں کا اثر نہیں ہو سکتا''۔ [Colonel Lorimer, "Brushuski Language."]

۶۔ ''یہ خطہ ایک عجیب زبان کا جزیرہ دکھائی دیتا ہے جو کہ ہند یورپی، تبتی اور ترکی زبانوں کے گروہوں کے سنگم پر واقع ہے لیکن اس کا رشتہ ان میں سے کسی سے بھی نہیں۔ بروشسکی ساری ریاست ہنزہ میں نہیں بولی جاتی بلکہ اس کے صرف وسطی حصے میں ہی بولی جاتی ہے''۔ [Barbara Mons, "High Road to Hunza."]

بروشسکی: ناخ داغستانی لسانی گروہ سے مشابہت:

عالمی سطح کے ماہرینِ لسانیات کی تحقیقات سے یہ بات اس حد تک ثابت ہے کہ بروشسکی زبان کا جینیاتی سلسلہ کسی بھی بڑے لسانی گروہ سے نہیں ملتا۔ لیکن پھر بھی اس کا فاعلی مجہولی انداز دارد (Dardic) اور دراوڑی (Dravidian) زبان سے کسی حد تک مماثل ہے۔ قفقازی زبانوں (Caucasian) کے اثرات کی جھلک دیگر زبانوں کے مقابلے میں بروشسکی پر کچھ حد تک نظر آتی ہے کیوں کہ اس زبان کا خطہ جغرافیائی طور پر ان علاقوں سے زیادہ دور نہیں۔ کیوں کہ وادئ ہنزہ سے نکلنے والی باریک سی جغرافیائی لسانی پٹی وسطی ایشیا اور مشرقِ وسطی کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہنگری تک چلی جاتی ہے۔ اور اس لسانی پٹی میں قفقازی زبانیں (Caucasian) بولنے والوں کی کثیر تعداد آباد ہے۔ شاید اس جغرافیائی قربت کے باعث بروشسکی پر ان زبانوں کے اثرات پڑے ہوں اور غالباً اسی لیے ناخ داغستانی لسانی گروہ (Nakh-Dagestani) سے اس زبان کی کچھ مماثلت ماہرینِ لسانیات کو حیرت زدہ کرتی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مشرقی ایشیا کی تمام زبانوں پر اثر انداز ہونے والی سنسکرت کے اثرات سے بروشسکی محفوظ رہی حتیٰ کہ اپنی قریبی ہمسایہ تبتی اور بلتی زبانوں کا کوئی اثر بروشسکی نے قبول نہیں کیا۔ قریب ترین ہمسایہ زبانوں کے اثرات سے محفوظ رہنے والی یہ زبان دور دراز کی قفقازی زبانوں (Caucasian) اور ہنگری زبان کے زیرِ اثر کیسے آ گئی؟ اس

اہم سوال کا جواب ڈاکٹر نصیرالدین نصیری کی اس تحقیق میں پنہاں ہے کہ بروشو قوم پہلے ہنگری میں آباد ہوئی تھی۔لیکن یہ تحقیق بھی مزید تحقیق طلب ہے۔

بروشسکی زبان پر عالمی تحقیقات:

George Morgenstierne نے ۱۹۳۲ء میں بروشسکی زبان پر Lorimar کی تحقیقی پیش رفت سے آگاہ کیا تھا۔اس کے بعد اس زبان میں طویل عرصے تک مزید کسی اہم پیش رفت کی اطلاع نہیں مل سکی۔تیس سال کے طویل وقفے کے بعد ہائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی کے ادارہ مطالعہ شرقیہ میں Hermann Berger نے اس موضوع پر تحقیق کر کے اس زبان کے نئے افق دنیا پر روشن کیے۔ان کے نائب ڈاکٹر وان اسکائی ہاک نے "کسر کی کہانی" بروشسکی سے ترجمہ کی تو بعض نئے گوشے وا شگاف ہوئے۔ٹھیک اسی دور میں ڈاکٹر نصیرالدین بروشسکی زبان میں تحقیقات کے نئے افق روشن کر رہے تھے۔عربی رسم الخط میں ان کی پہلی مختصر کتاب بُا کُلِم بُرشسکی ۱۹۷۰ء میں اکادمی تحقیقاتِ بروشسکی کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔یہ بروشسکی ادب اور زبان کے قواعد پر پہلی کتاب تھی۔اس کی اشاعت کے ٹھیک چار سال بعد ۱۹۷۴ء میں ماہر لسانیات برگر نے اپنے مطالعات کی بنیاد پر بروشسکی زبان کے تفصیلی قواعد شائع کیے جس کے باعث اس طلسم کدۂ حیرت کا دروازہ دنیا کے لیے کھل گیا۔۱۹۹۳ء میں مانٹریال یونیورسٹی کے پروفیسر تیفوں کی کتاب Hunza Proverbs۔ University of Calgary Press کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔اس کتاب میں پانچ ہزار تین بروشسکی محاورے جمع کیے گئے ہیں۔یہ نہایت اہمیت کا حامل کام ہے۔E.Tiffon نے یہ کتاب مشہور ماہر لسانیات L.Col Dr. Lorimer، ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے مشہور محقق Hermann Berger نیز مانٹریال یونیورسٹی کے محقق Y.Ch. Morin اور ڈاکٹر نصیرالدین ہونزائی کے تعاون سے تیار کی۔

بروشسکی رسم الخط کیا تھا؟ اس بارے میں تاریخ خاموش ہے اور آثار قدیمہ کے مخطوطات، قدیم نوادرات اور اساطیر سے ابھی تک اس زبان کے رسم الخط کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں مل سکا، لہٰذا ہرمن برگر نے بروشسکی الفاظ رومن حروف میں وضع کیے جنھیں بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔پروفیسر ہرمن برگر نے بروشسکی زبان کے الفاظ پر مشتمل پہلی جرمن بروشسکی لغت تیار کی جس میں پچاس ہزار الفاظ کا ذخیرہ جمع کر کے اس زبان کو محفوظ کر دیا گیا۔یہ لغت ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی اور اس کتاب کی تیاری میں پروفیسر ڈاکٹر نصیرالدین نصیر ہونزائی کا مرکزی کردار ہے جس کا اعتراف ہرمن برگر نے ان الفاظ میں کیا ہے:

Unter Mitarbeit von Nasiruddin Hunzai

جس کا مطلب ہے "یہ لغت پروفیسر ڈاکٹر نصیر الدین ہونزائی کے تعاون سے تیار کی گئی۔"

لوک ادب: کسی دیے کے پاس بیٹھنا:

ہنزہ میں بھی رات کو کھانے کے بعد دیے کی روشنی میں کہانی کہنے اور سننے کا رواج عام تھا۔ ان لوگوں میں کہانی سننے کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ "کسی دیے کے پاس بیٹھنا" محاورے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اکثر لوگ دن ڈھلتے اور چراغ جلتے ہی ان کچے پکے شیموں، دیاروں اور حویلیوں میں چراغ کی لو کے ارد گرد پروانوں کی طرح جمع ہو جاتے ہیں اور انسانی، اخلاقی اور نیکی کی باتیں سنتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بروشسکی زبان کی متعدد کہانیاں فرضی کرداروں پر مبنی نہیں بلکہ ان کے کردار یہاں کی روایتی تاریخ کے کردار ہیں جن کا تعلق یہاں کے عوام اور ان کے حکمرانوں سے ہے۔

بروشسکی علاقے کا لوک ادب وہاں کے باشندوں کی اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی اقدار کا آئینہ دار ہے۔ یہ ادب لوک کہانیوں میں محفوظ ہے۔

ہنزہ کی تاریخ: قتل و غارت گری کی داستان:

یہ کہانیاں ایک خاص ماحول میں بسنے والے لوگوں کے اعمال کا عکس پیش کرتے ہیں۔ ان کہانیوں کو ہم مندرجہ ذیل طور پر تقسیم کر سکتے ہیں[۱] وہ کہانیاں جو سیاسی واقعات یا حکمران طبقہ سے متعلق ہیں۔[۲] جو یہاں کے باشندوں کے اجتماعی اعمال پر مبنی ہیں۔[۳] جو انفرادی کرداروں کی عکاسی کرتی ہیں۔ [۴] جن میں مافوق الفطرت عناصر کا ذکر ہے۔ اور [۵] وہ کہانیاں جو دوسرے علاقوں سے متعلق ہیں اور یہاں رائج ہیں۔

پہلے حصے سے متعلق دو نمایاں کہانیاں: ۱۔ شری بدت کی کہانی ۲۔ ناپکنس اور درامتنگ کی کہانی ہے۔[۳۲]

قتل کر دینا معمولی بات ہے، کوئی حکمراں طبعی موت نہ مرا:

دونوں کہانیاں جن کرداروں کے گرد گھومتی ہیں وہ یہاں کی سیاسی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس لیے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا تو نہیں کہ یہاں کی سیاسی تاریخ انہی روایات پر مبنی ہو؟ جس طرح ان کہانیوں میں قتل کے واقعات کا اعادہ ہوتا ہے، اُسی طرح ہنزہ کی تاریخ قتل و غارت کی ایک مسلسل داستان ہے۔ شاید ہی کوئی حکمران ایسا ہوگا جو اپنی طبعی موت مرا ہو ورنہ ایک کو دوسرے نے طاقت یا دھوکے سے قتل ہی کیا اور یہ سلسلہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں صفدر علی کے برسرِ اقتدار آنے پر ختم ہوا۔[۳۳]

کہانیاں قتل و خون کے واقعات ہی کی حامل ہیں۔ پیار و محبت اور گہرے دوستانہ تعلقات کے باجود

ایک دوسرے کو قتل کر دینا معمولی بات سمجھا جاتا رہا ہے۔[۳۴]

لوک کہانیاں: عشق و محبت سے خالی:

بہت سی ایسی کہانیاں بھی ملتی ہیں جن میں وفاداری، احسان مندی، دوسروں کے لیے خطرات مول لینا اور مکاری اور فریب کے افعال پر قدرت کی طرف سے سزا پانے کے سبق آموز واقعات کا بیان پایا جاتا ہے۔ البتہ عشق و محبت کی داستانیں مفقود ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شادی کے سلسلے میں ان کے ہاں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی تھی۔[۳۵]

لوک گیت: ہجر و فراق کی داستان:

کہانیوں کے برعکس یہاں کے لوک گیتوں میں عشق و محبت کے جذبات کا اظہار پایا جاتا ہے۔ ایک گیت کا ترجمہ دیا جاتا ہے جس میں وصل سے محروم، فراق کی آگ میں جلنے والے دو دلوں کی داستان محبت بیان کی گئی ہے۔ دیکھیے بیان کی سادگی اور جذبات کے بے ساختہ اظہار نے کرداروں کے ماحول کی کتنی واضح تصویر پیش کی ہے۔

ویرلوک : میری قسمت میں ایک دور دراز کا سفر ہے
اے میرے زخم مندمل کرنے والے!
میں اپنے تعویذ بھلا آیا ہوں
خدا کرے میرے لیے وہ جنازے کی خیرات ہوں
جب علاقے میں شاہین آجائے
تو تیتر کے لیے امن کی صورت کوئی نہیں رہتی
اگر میرے اور تیرے درمیان دوستی ہوئی
تو پھر ملک میں میں بدامنی نہیں ہوگی
تمہارا یہ حال کیوں ہے؟
اے میرے خوبصورت زلفوں والے محبوب!

ویرلوک : میں نے کہا۔ میں پریوں کی وادی کی راہ جاؤں گا۔
جب راہ کھو بیٹھا تو ہوا کے پراسرار طوفان نے مجھے گھیر لیا
میرے دوست۔ پراسرار طوفان کا کیا علاج ہوسکتا ہے!

امیکس لوک: شاید شوئی پری کے بال علاج ثابت ہوسکیں[۳۶]

زبانیں اور استعماری طاقتیں:

بروشسکی زبان دنیا سے خود مٹی یا اسے مٹا دیا گیا؟ اس بارے میں تاریخ کے دفتر خاموش ہیں، لیکن اس بات کا امکان موجود ہے کہ اس زبان کو طاقت کے زور پر ختم کر دیا گیا ہو لیکن اس زبان کے اندر موجود مخفی طاقت نے اسے زندہ رکھا اور روحانی طاقت نے اسے حیاتِ نو عطا کی۔ گزشتہ تین سو سال کی استعماری تاریخ بتاتی ہے کہ ولندیزی (Dutch)، انگریزی (English)، پرتگیزی (Portuguese)، روسی (Russian)، امریکی (American)، فرانسیسی (French) اور ہندو (Hindus) استعمار نے دنیا میں جہاں بھی قبضے کیے وہاں نوآبادیات قائم کیں اور لوگوں کو غلام بنایا۔ امریکا اور آسٹریلیا کے اصل باشندوں کو وحشی قرار دے کر قتل کر دیا گیا اور ان کی زبانیں مٹا دی گئیں۔ جہاں زبانیں نہیں مٹائی جا سکیں وہاں ثقافتی استعماریت کے ذریعے زبانوں کے رسم الخط کو تبدیل کیا گیا تا کہ ان نوآبادیات کو ان کے عظیم الشان تاریخی ورثہ سے محروم کر دیا جائے۔ اس کے نتیجے میں جب یہ نوآبادیات اپنے تاریخی ورثے کو پڑھنے کے قابل نہ رہیں تو ان کے تاریخی آثار و عجائبات وہاں سے منتقل کر کے ماضی کے اس ورثے سے قائم ایک جذباتی تعلق کو بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر کے ان نوآبادیات کے لوگوں کے لیے ان کی تاریخ کو اجنبی بنا دیا گیا۔ اس کی ایک مثال، براعظم آسٹریلیا پر برطانوی قبضے کے بعد، مقامی لوگوں کا اور ان کی زبانوں کا قتل عام ہے۔

براعظم آسٹریلیا: زبانوں کا قتل عام:

ایشیا سے ملحقہ جنوب میں دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ آسٹریلیا واقع ہے جو ایک براعظم بھی ہے۔ زبانوں کے قتل عام پر مبنی علمی و تحقیقی مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ برطانوی استعمار نے نہ صرف اس براعظم کو لوٹا اور اس کے مکینوں کا قتل عام کیا بلکہ ان کی زبانوں کا بھی قتل عام کیا گیا یہ سلسلہ اس علاقے پر برطانیہ کے تسلط سے شروع ہوا اور ہزاروں زبانوں کی تباہی بربادی اور معدومی پر منتج ہوا۔

ماہرین ارضیات کے مطابق براعظم آسٹریلیا کی سرزمین دنیا کی قدیم ترین ساخت کی حامل ہے جو آج سے تقریباً ۴ارب ۱۰ کروڑ سال سے ۵۷ کروڑ سال پہلے معرض وجود میں آئی۔

انگریزوں کی آمد سے سینکڑوں سال پہلے یہاں کے شمالی ساحلوں پر چینی اور انڈونیشیائی اقوام کا آنا جانا رہتا تھا۔ انگریزوں کی آمد یہاں ایبل تسمان سے شروع ہوتی ہے۔ ایبل تسمان نے ۱۶۴۲ اور ۱۶۴۴ میں اور جیمز کک نے ۱۷۷۰ میں اس براعظم کو تسخیر کیا لیکن کیپٹن آرتھر فلیپ نے ۱۷۸۸ میں یہاں نوآبادیات قائم کرنے کا سلسلہ حقیقی معنوں میں شروع کیا۔

جزیرہ تسمانیہ کے لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا:

براعظم آسٹریلیا کی زبانوں کے ساتھ ساتھ باشندوں کے خاتمے کا پہلا قدم جزیرہ تسمانیہ میں اٹھایا گیا۔ اٹھارہویں صدی کے درمیان ہی جزیرہ تسمانیہ کے تمام مقامی لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ آسٹریلیا کے اصل باشندوں کے خلاف امتیازی قوانین تیار کیے گئے جو ۱۹۶۰ تک روبہ عمل رہے لیکن ان قوانین کو وہاں کی انسانی حقوق کی تنظیموں کے احتجاج کے بعد ۱۹۶۰ کے عشرے میں منسوخ کرنا پڑا لیکن اس تنسیخ سے کوئنز لینڈ مستثنیٰ رہا۔ آسٹریلیا کی ۸ ریاستیں ہیں۔ مقامی لوگوں کی آبادی آسٹریلیا کے شمال اور شمال مشرقی حصے میں زیادہ بستی ہے۔

آسٹریلیا کی ۲۳۵ زبانیں موت کی دہلیز پر:

آسٹریلیا کی تقریباً ۲۶۸ زبانوں میں سے ۲۳۵ زندہ ہیں اور ۳۱ مر چکی ہیں لیکن بقیہ ۲۳۵ زبانیں بھی موت کی دہلیز پر آخری سانسیں گن رہی ہیں۔ ان زبانوں میں صرف چند ہی ایسی ہوں گی جن کے بولنے والے ہزار یا ڈیڑھ ہزار کے قریب ہوں گے لیکن باقی تمام زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد تین چار یا دس بیس سے زیادہ نہیں۔

شمالی صوبہ کوئنز لینڈ:

سرکاری سرپرستی میں آسٹریلیا کے اصل نگر نیتے باشندوں کا قتل عام اور استحصال ۱۹۶۰ تک آسٹریلیا میں ہوتا رہا، عوامی دباؤ کے باعث حکومت نے اسکول میں داخلہ اور دفاتر میں نوکری وغیرہ کے حقوق مجبوراً بحال کیے لیکن شمالی صوبہ کوئنز لینڈ کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ یہ صوبہ شمال میں ہے جہاں پر آج بھی آسٹریلیا کی معدوم ہونے والی زیادہ تر زبانیں ہیں۔ ریاست وکٹوریہ میں جو جنوب مغرب میں ہے آج بھی ان مقامی لوگوں کو حق ملکیت حاصل نہیں، یہاں جن علاقوں میں یہ لوگ محصور ہیں یا محدود ہیں، ان علاقوں میں اصل باشندے زمین کی ملکیت نہیں رکھ سکتے نہ انھیں خریدنے کی اجازت ہے۔ یہ ریاست یہاں کی امیر ریاست ہے اور سفید فام نسل کے لوگ یہاں زیادہ بستے ہیں۔

قدیم باشندوں کے حقوق ۲۰۰۴ء میں معطل:

دسمبر ۲۰۰۴ء میں رائٹر (Reuters) نیوز ایجنسی نے یہ خبر دی کہ آسٹریلیا کے وزیر اعظم ہاورڈ نے مقامی لوگوں کو تحفظ دینے اور ان کی زبانوں کو بچانے کے لیے ان کے علاقوں میں رات کا کرفیو نافذ کر دیا ہے اور شراب کی فروخت ممنوع قرار دی گئی ہے۔

زبانوں کو مٹانے کے بعد تحفظ کی تحریک:

۱۹۶۰ء میں قائم آسٹریلیائی ادارہ برائے مطالعاتِ باشندگانِ اصل (Australian Institute of Aboriginal Studies) نے ان مقامی زبانوں پر تحقیق کے کام کا آغاز کیا یہ ادارہ دارالحکومت کینبرا میں ہے۔ یہ ادارہ وقتاً فوقتاً زبانوں کے بچاؤ کے لیے کام کرتا ہے جن میں مختلف زبانوں کو محفوظ کرنا، ان کے نغموں اور لوریوں کو صوتی انداز میں ریکارڈ کرنا وغیرہ شامل ہے۔ دو صدیوں تک زبانوں کا قتلِ عام کرنے کے بعد ان کی حفاظت کا انوکھا اور اچھوتا خیال جدیدیت اور انسانیت کی عریب و غریب شکل ہے۔ پہلے باشندوں کو قتل کیا گیا جو بچ گئے ان کی زبانوں کو مٹایا گیا اور اب عالمی انسانی و تہذیبی ورثے کے تحفظ کے نام پر زبانوں کی حفاظت کے منصوبوں کے ذریعے اپنی انسانیت کے گن گائے جا رہے ہیں۔

آسٹریلیا کی تمام زبانیں ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کافی حد تک مشابہہ ہیں۔ ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ آج سے ۵ ہزار سال پہلے یہ تمام زبانیں ایک بڑی زبان تھی۔ ان تمام زبانوں کے لسانی و ثقافتی روابط انڈونیشیائی اور پاپوا نیو گنی (Papua New Guinea) کی زبانوں سے بھی ملتے ہیں۔ لیکن ان دونوں ممالک میں تو یہ زبانیں خوب پھل پھول رہی ہیں لیکن آسٹریلیا میں انھیں تہس نہس کر دیا گیا ہے۔

مٹنے والی زبانوں کی فہرست:

ذیل میں آسٹریلیا کی ایسی زبانوں کے نام دیے جا رہے ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد صرف چند نفوس ہے اور اس مضمون کی اشاعت تک ان میں سے کتنی ہی زبانیں معدوم ہو چکی ہوں گی:

۱۔ ادینیا ماتھن ہا (Adynyamathanha): یہ زبان آسٹریلیا کے جنوب میں بولی جاتی تھی اب وہاں اس کے بولنے والے صرف ۲۰ ہیں۔

۲۔ امی (Ami) اس کے بولنے والے ۳۰ ہیں اور یہ شمال میں ڈارون میں بستے ہیں۔

۳۔ الاوا (Alawa): شمالی علاقے میں بولی جاتی ہے اور بولنے والوں کی تعداد ۱۷ سے ۲۰ تک ہے۔

۴۔ ارابانا (Arabana): سن ۱۹۸۱ میں اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ۸ تھی اور یہ لوگ جنوب میں بر ڈزول جھیل آئری (Lake Eyre) کے مغربی حصے میں بستے ہیں۔

۵۔ النگِتھ (Alngith): آسٹریلیا کے شمال مشرق علاقے جزیرہ نما کیپ یارک میں اس کے بولنے والے اب صرف ۳ کی تعداد میں ہیں۔

۶۔ اندے گیرے بن ہا (Andegerebinha): بولنے والوں کی تعداد ۱۰ یا اس سے کم ہے۔ شمالی علاقے میں بولی جاتی ہے۔

۷۔انتا کارن یا(Antakarinya) جنوبی آسٹریلیا کے شمال مشرق میں یہ لوگ بستے ہیں اوران کی تعداد ۵۰ کے قریب ہے۔

۸۔امارگ(Amarag):شمالی علاقہ میں صرف چند بولنےوالے ہیں یہ زبان فوری معدوم ہونے والی ہے۔

۹۔اریبا(Areba):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ۱۲ ہے جو شمال مشرق میں کوینز لینڈ کے جزیرہ نما کیپ یارک میں بستے ہیں۔

۱۰۔اتمپایا(Atampaya):۱۰۴ ایلی یٹ کریک(Eliot Creek) کوینز لینڈ۔

۱۱۔ایابادھو(Ayabadhu):بولنےوالوں کی تعداد ۱۶ ہےاور یہ لوگ بھی شمالی آسٹریلیا میں جزیرہ نما کیپ یارک کی دریائے کول مین(Coleman) کے شمال میں بستے ہیں۔

۱۲۔باڈی(Baadi):۲۰،اس زبان کو تحفظ دینے کی غرض سے محصور کیا گیا ہےاوران کا علاقہ مغربی کمبرلی ریجن Western Kimberley Regionمغربی آسٹریلیا میں ہے۔

۱۳۔بڈی مایا(Badimaya):تقریباً معدوم ہورہی ہے بولنےوالوں کی تعداد ایا ۲ ہےاور یہ مغربی آسٹریلیا میں بستے ہیں۔

۱۴۔بنجالنگ (Bandjalang)زبان بولنے والے صرف دس ہیں اور علاقہ وڈین بونگ (Woodenbong)نیو ساؤتھ ویلز میں رہتے ہیں۔

۱۵۔بنجی گلی(Bandjigali):۱،شمالی وہائٹ کلف(White Cliffs)نیو ساؤتھ ویلز۔

۱۶۔بیرو پوائنٹ(Barrow Point)صرف ایک بولنےوالا، کیپ یارک کوینز لینڈ شمالی آسٹریلیا۔

۱۷۔بایونگو(Bayungu):۶،ویسٹ پلبارا کی لینڈن اور مینیلیا دریاؤں کے درمیان،مغربی آسٹریلیا میں یہ لوگ بستے ہیں۔

۱۸۔بدیارا(Bidyara):۲۰،کوینز لینڈ کے تامبو اور اوگاتیلا کے علاقوں میں یہ زبان بولنےوالےلوگ بستے ہیں۔

۱۹۔بیری(Biri):۵،جنوب مشرقی چارٹر ٹاورز(Charter Towers) کوینز لینڈ۔

۲۰۔بروم پرلنگ(Broome Pearling):۳۰ کے قریب لوگ خلیج بیگل (Beagle Bay) مغربی آسٹریلیا میں بستے ہیں۔

۲۱۔بونابا (Bunaba):سو کے قریب لوگ یہ زبان بولتے ہیں جو فٹزروئے کراسنگ ایریا (Fitzroy Crossing Area)مغربی آسٹریلیا میں بستے ہیں۔

۲۲۔بورڈونا (Burduna):۳،مغربی آسٹریلیا کی ہنری اور ایرلینڈن دریاؤں کے کنارے یہ لوگ بستے ہیں۔

۲۳۔جامنجنگ (Djamindjung):۱۳۰،کوئنز لینڈ،منگاتا کے مغرب میں۔

۲۴۔جنگون (Djangun): منگاتا،کوئنز لینڈ،صرف ایک زبان بولنے والا باقی ہے۔

۲۵۔دھرگری (Dhargari):۶،مغربی آسٹریلیا،معلیلیا اور دریائے لیون کے زیریں حصے میں بستے ہیں۔

۲۶۔جاوی: (Djawi):۱،مغربی آسٹریلیا،خلیج برنس ویک (Brunswick Bay) کے کنارے۔

۲۷۔جنبا (Djinba):۹۰،بولنے والے ارن ہیم لینڈ Arnhem Land ناردرن ٹیریٹری۔اس زبان کا ایک اور لہجہ دابی (Dabi) ۱۹۹۱ تک میں معدوم ہو چکا ہے۔

۲۸۔جنگیلی (Djingili):۱۰،ایلیٹ،ناردرن ٹیریٹری۔

۲۹۔جواری (Djiwarli):اس زبان کو بولنے والا صرف ایک بوڑھا ہے،کو واگسٹ،مغربی آسٹریلیا۔

۳۰۔دیراری (Dirari):۱،جنوبی آسٹریلیا،جھیل آئری کے شمال میں۔

۳۱۔دھلانجی (Dhalandji):۲۰،مغربی آسٹریلیا میں ویسٹ پلبارا میں خلیج ایکس ماؤتھ کے کنارے بستے ہیں۔

۳۲۔ دیابوگے (Dyaabugay):۳،کوئنز لینڈ،پورٹ ڈگلس کے سطح مرتفع پر۔

۳۳۔ڈارلنگ/بگونجی (Darling/ Bagundji):۵،دریائے ڈارلنگ کے کنارے،نیو ساؤتھ ویلز۔

۳۴۔دیابر دیابر (Dyaberdyaber):۳،خلیج بینگل،مغربی آسٹریلیا۔

۳۵۔دیانگادی (Dyangadi):۵،دریائے میک لیے،آرمی ڈیل نیو ساؤتھ ویلز۔

۳۶۔دی ربال (Dyirbal):۴۰،دریائے ہوبرٹ،کوئنز لینڈ

۳۷۔دیوگن (Dyugun):۲،بروم (Broome) مغربی آسٹریلیا۔

۳۸۔ایرے (Erre):۱،کوہ ہاؤشپ (Mt. Howship) ناردرن ٹیریٹری۔

۳۹۔فلنڈرز آئی لینڈ (Flinders Island):۳،جزیرہ نما کیپ یارک خلیج پرنس شارلٹ،کوئنز لینڈ۔

۴۰۔گاجی راونگ (Gadjerawang):۳،یہ لوگ دریائے وکٹوریا کے سرے پر مغربی آسٹریلیا میں بستے ہیں۔

۴۱۔گگاڈو (Gagadu):۲،اوئن پلی،ناردرن ٹیریٹری۔

۴۲۔گمبیرا (Gambera):۲،شمالی کمبر لینڈز،مغربی آسٹریلیا۔

۴۳۔گنگ گالی دا (Ganggalida):۵،بورک ٹاؤن (Bourke Town) کوئنز لینڈ

۴۴۔گیاردلت (Gayardilt):۵۰،خلیج کارپنٹیریا،کوئنز لینڈ۔

۴۵۔جی یگ (Giyug):۲،ڈارون کے جنوب مغربی میں ناردرن ٹیریٹری۔

۴۶۔گونی یانڈی (Gooniyandi):۱۰۰،دریائے مارگریٹ مغربی آسٹریلیا۔

۴۷۔ گوگج (Gugadj): ۱، دریائے نورمن، کوئنزلینڈ۔

۴۸۔ گوگو بدھون (Gugu Badhun): ۲، آئی نا سلے (Einasleigh) کوئنزلینڈ۔

۴۹۔ گوگوبیرا (Gugubera): ۱۵، مشن اور ریگل دریاؤں کے سرے پر کوئنزلینڈ میں یہ لوگ بستے ہیں۔

۵۰۔ گوگوئی مجر (Guguyimidjir): ۳۰ لوگ یہ زبان بولتے ہیں لیکن ۲۵۰ سے ۳۰۰ کے قریب یہ زبان بولنے والے لوگ اب انگریزی بولنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہوپ ویل (Hopevale) کوئنزلینڈ

۵۱۔ گنگابولا (Gungabula): ۲، انجون (Injune) کوئنزلینڈ۔

۵۲۔ گنیا (Gunya): ۳، ویانڈرا (Wyandra) کوئنزلینڈ۔

۵۳۔ گوراگون (Guragone): ۲۰، ارن ہیم لینڈ، ناردرن ٹیریٹری۔

۵۴۔ گرجر (Gurdjar): ۳۰، دریائے نورمن کے شمال مشرقی کنارے کوئنزلینڈ۔

۵۵۔ گوو امو (Guwamu): ۱، امارانوا دریا، کوئنزلینڈ

آسٹریلیا کی مردہ زبانیں:

مندرجہ بالا زبانیں آسٹریلیا کی وہ زبانیں ہیں جو موت کے قریب ہیں اور اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہی ہیں۔ مگر ذیل میں اس براعظم کی وہ زبانیں دی جا رہی ہیں جو اب مر چکی ہیں۔

اگوامین (Agwamin)	اگھو تھرنگ گالو (Aghu Tharnggalu)
اوابا کال (Awabakal)	بنگ گرلا (Banggarla)
بیالی (Bayali)	پرلاتپا (Pirlatapa)
تجوررُورُو (Tjurruru)	تھراول (Thurawal)
ڈھرگا (Dhurga)	ڈیری (Dieri)
کری یارا (Kariyarra)	کلارکو (Kalarko)
کلکوٹنگ (Kalkutung)	کنگاراکانی (Kungarakany)
گنگ گولو (Gangulu)	گورینگ گورینگ (Gureng Gureng)
گوگو ورا (Gugu Warra)	لینن گی تج (Leningitij)
ملگانا (Malgana)	مے کولان (Maykulan)
نگان یائے وانا (Nganyaywana)	نگانڈی (Ngandi)
نے رن یے ری (Narrinyeri)	وری ینگ گا (Wariyangga)

اٹھائیس XXVIII

وِنڈارنگ (Wandarang)　　وورِمی (Worimi)

وُولی وُولی (Wuliwuli)　　یالارن نگا (Yalarnnga)

یُوگم بل (Yugambal)[۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲]

کیتھولک عیسائی: رونگو زبان کا خاتمہ:

بحرالکاہل کا جزائر ایسٹر (Easter Islands) جسے ولندیزی سیاح نے ۱۷۲۲ میں دریافت کیا تھا۔ اس جزیرے میں آج کل تو رومن رسم الخط رائج ہے لیکن ۱۸۶۴ء سے پہلے اس جزیرے کا اپنا رسم الخط تھا جسے ''رونگورونگو'' کہا جاتا تھا۔ اس خط کو شارک مچھلی کے دانت سے لکھا جاتا تھا۔ اس خط کو پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ جب ایک صفحہ یا ایک سطر پڑھ لی جاتی تو اس صفحے کا سرا گھما کر نیچے کر دیا جاتا اور اس طرح دوسری سطریں سامنے آجاتیں یعنی اس کو پڑھنے کے لیے صفحے کو گھمایا جاتا تھا۔ ۱۸۶۴ء میں جب کیتھولک عیسائی مبلغین یہاں آئے تو انھوں نے ان لکڑی کی تختیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ یہ لکڑی کی تختیاں مختلف حجم کی تھیں ان میں سے آج صرف ۱۵ تختیاں دستیاب ہیں ان میں سب سے بڑی تختی کا حجم ۶ فٹ ہے۔ یہ رسم الخط قدیم سندھی رسم الخط سے مشابہ ہے۔ ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ استعماری طاقتوں کے ساتھ ساتھ مذہبی استعماریت نے بھی مختلف زبانوں کو کس طرح ختم کیا۔

ہندو استعمار اور پالی و مقامی زبانیں:

بودھ مت کا آغاز ۶۰۰ ق م میں ہوا جو دراصل آریہ غلبہ یا (ہندو مت) کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ یہ اعلان جنگ لسانی طور پر بھی سنسکرت کا مدمقابل تھا بودھ مت نے سنسکرت کو اپنے طور پر کسی حد تک اپنایا ورنہ اس کی عوامی زبان ماگدھی تھی اور پالی ادبی حیثیت رکھتی تھی۔ چناں چہ راجا اشوک کے کتبے آج تک اس امر کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ پالی دراصل متن یا سطر کو کہتے ہیں اور یہ لفظ قطار اور حاشیے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پالی بھی سنسکرت کی طرح مختلف رسم الخطوں میں لکھی جاتی تھی۔ سب سے پہلے سنہالا رسم الخط میں حضرت مسیح سے سو سال قبل ضبط تحریر میں لائی گئی۔

ہندو مت کا احیاء ہوا تو بدھ مذہب اور پالی زبان خاک و خون کے المناک مناظر سے روشناس ہوئے۔ بدھ دھرم اور اس کی زبان کی درگت بنائی گئی۔ بودھ مت کے علماء کو قتل کر کے ان کے سروں کو اوکھلی میں کوٹا کر ہڈیوں کے سفوف کو ہوا میں اڑا دیا گیا۔ مذہب کے ساتھ زبان بھی مورد عتاب ٹھہری۔ پورے شمالی ہند کی زبانیں بھی زبردست شکست و ریخت سے دوچار ہوئیں۔ طاقت کے بل پر پالی اور دیگر زبانوں کو مٹانے اور سنسکرت کو زندہ کرنے کی بھرپور کوشش ہوئی لیکن سنسکرت عوامی زبان نہ بن سکی۔ اسلام کی پوری تاریخ اس قسم کی

عصبیت تشدد سفاکی اور بہیمت سے پاک ہے ۔ارشاد رسالت مآبؐ ہے کہ ''اگر دشمن کے شر سے بچنا چاہتے ہو تو اس کی زبان سیکھ لو'' یہ حکیمانہ قول مسلمانوں میں زبانوں کو سیکھنے کا سبب بنا اور انھوں نے اس حکمت کے ذریعے دشمنوں کو اسلام کے حرم میں داخل کر لیا اور ان کی زبانوں کو بھی اپنا بنالیا۔اس قید میں آنے کے بعد کوئی رہائی پر آمادہ نہ ہوا۔

اسی لاکھ ریڈ انڈین کا قتل عام:

براعظم شمالی امریکا کو یورپی مہم جوؤں نے سولہویں صدی کے اوائل میں دریافت کیا۔کولمبس کی آمد کے وقت امریکا میں جو لوگ آباد تھے ان کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ بیس تا پینتیس ہزار سال قبل ایشیاء سے امریکا آئے تھے۔عام طور پر ان لوگوں کو سرخ ہندی کہا جاتا ہے۔

کولمبس کی آمد کے وقت موجودہ براعظم شمالی امریکا میں ایک اندازے کے مطابق تقریباً ایک کروڑ ریڈ انڈینس آباد تھے۔گو کہ اندازوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔براعظم متحدہ امریکا کی تاریخ کا سیاہ باب یورپی حملہ آوروں اور آباد کاروں کے ہاتھوں اس پوری آبادی کی نسل کشی اور ان کی جائیداد اور زمینوں پر زبردستی قبضہ کرنا اور ان کو چھپانا تھا ایک محتاط اندازے کے مطابق یورپی آباد کاروں نے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران شمالی امریکا میں تقریباً ستر لاکھ ریڈ انڈینوں کا قتل کیا تھا۔اس قتل عام کے لیے ہر ممکن وسائل استعمال کیے گئے اور ہر طریقہ اپنایا گیا۔قتل وغارت گری، آبادیوں میں بیماریوں کا پھیلانا،عورتوں کو زیادتی کا شکار بنانا وغیرہ عام بات تھی۔دو صدیوں کی قلیل مدت ایک پورے براعظم کی آبادی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا اور ان کا براعظم ان سے لوٹ لیا گیا۔

انسانی تاریخ کا عظیم ترین قتل عام:

شمالی اور جنوبی امریکا میں قتل عام کے اس سلسلہ کا آغاز ہسپانیوں نے کیا تھا۔ہسپانوی مصنف "Tzvetan Todorov" اسے ''انسانی تاریخ کا عظیم ترین قتل عام'' (The greatest genocide in human history) قرار دیتا ہے۔سولہویں صدی کے ہسپانوی پروفیسر اور ماہر الٰہیات Francisco de Vitoria نے اس قتل عام کا جواز ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

''سرخ ہندی اس قابل نہیں ہیں کہ وہ نظم ونسق قائم کر سکیں اور حکومت کو اپنے بل بوتے پر چلا سکیں وہ پاگلوں اور وحشی درندوں سے بدتر ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی غذا وحشی درندوں کی غذا سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے بلکہ ان کی بے عقلی اور بے وقوفی دوسری قوموں کے بچوں اور پاگلوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔'' مصنف Tzvetan Todorov کے مطابق پروفیسر فرانسس کا سولہویں صدی کی ہسپانوی

تحریک انسانیت (پرستی) کے اساطین میں شمار ہوتا تھا۔ (One of the Pinnacles of Spanish Humanism In The Sixteenth Century) غرض پروفیسر فرانسس کے افکار کے مطابق سرخ ہندی اس قابل نہیں تھے کہ انسان کہلا سکیں اس لیے ان کا قتل عام جائز تھا۔

مسئلہ صرف پروفیسر فرانسس کا نہیں تھا، جارج واشنگٹن سرخ ہندیوں کو انسانی لباس میں بھیڑیے کہتا ہے کیوں کہ یہ لوگ انسان کہلانے کے مستحق نہیں تھے۔ مارکس کے فلسفے کے مطابق یہ لوگ People without Hisotry تھے۔[اس لیے ان کا قتل عام جائز تھا۔]

لاک کے خیال میں:

There is no difference between a buffalo and a native American.

کانٹ کے خیال میں:

Blacks are not human they live in woods.

ہیوم نے ایک کالے کو کسی گورے سے نہایت عالمانہ گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تو اس نے حیرت کا اظہار کیا کہ کالے اتنے عقل مند بھی ہوسکتے ہیں۔

انگریز آبادکاروں کے ہاتھ قتل عام:

جب انگریزوں نے ہسپانیوں کے اس مشن کی وراثت پائی تو انھوں نے اس مشن کو ان بلندیوں تک پہنچایا کہ ہسپانیوں کا قتل عام اس کے مقابلے میں ایک معمولی چیز نظر آتا ہے۔ گو کہ اس قتل عام کو جواز دینے کے لیے جوبات کہی گئی وہ وہی تھی جو پروفیسر فرانسس کے مذکورہ بالا اقتباس سے واضح ہوتی ہے۔ جارج واشنگٹن کے مطابق سرخ ہندی انسانی لباس میں بھیڑیے ہیں۔ تہذیب کے قیام میں سدراہ ہیں اور انسانی تہذیب کی بقاء اور قیام کی خاطر ان کا قلع قمع کرنا ضروری ہے۔ گو کہ جواز ایک ہی تھا لیکن امریکا کے انگریز آبادکاروں نے جس درندگی اور جس مہارت کے ساتھ دوسو سال کے اندر پوری نسل کا خاتمہ کیا وہ انہیں کا حصہ ہے۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک کا تعلق درندگی سے ہے دوسری کا مہارت سے ہے۔

قصاب اسکاٹ لینڈ: لارڈ کمبر لینڈ:

جہاں تک مہارت کا تعلق ہے اس میں بھی امریکا میں آباد ہونے والے انگریز، ہسپانوی آبادکاروں سے کئی ہاتھ آگے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکا میں آباد ہونے والے انگریز آبادکاروں کو اس قسم کے قتل عام کا وسیع تجربہ تھا۔ شمالی امریکہ میں وحشی، سرخ ہندیوں کے قتل عام سے پہلے انگریز اسکاٹ لینڈ میں ''وحشی'' کیلٹک

(Celtic) باشندوں کا قتل عام کر چکے تھے اور کیلٹک قتل عام کے تجربہ سے شمالی امریکا میں بھرپور فائدہ اٹھایا گیا۔ مثال کے طور پر لارڈ کمبرلینڈ (Lord Cumberland) جسے قصاب اسکاٹ لینڈ کہا جاتا تھا اور جسے اسکاٹ لینڈ میں قتل عام کا وسیع تجربہ تھا۔ بعد ازاں امریکا گیا اور اس نے اپنے تجربے کو ان نئے "وحشیوں" کو ختم کرنے کے لیے استعمال کیا۔ درندگی اور مہارت کے اس امتزاج نے دو سو سالوں میں ایک پوری نسل کا خاتمہ اور ان کے براعظم پر مکمل قبضہ کی شکل اختیار کی جس کی نظیر ساری تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ امریکی تحقیق کے تازہ اعداد و شمار کے مطابق یورپی قبضہ سے پہلے شمالی امریکا میں ایک کروڑ سرخ ہندی آباد تھے۔ لیکن دو سو سال کے قتل عام کے نتیجہ میں ان کی تعداد محض بیس لاکھ رہ گئی تھی۔

براعظم امریکا میں انسانوں اور زبانوں کا قتل عام:

مؤرخین کے مطابق صرف امریکا میں ۸۰ لاکھ ریڈ انڈین باشندوں کو وحشی قرار دے کر ہلاک کر دیا گیا اور ان کی زبانوں نوہاٹلا (Nauhatl)، یوما (Yuma)، چپوا (Chipewa)، توماہاک (Tomahawk)، موہاک (Mowhawk)، موہابے (Mojave)، نباہو (Navajo)، چوکٹا (Choctow)، پیما (Pima) اور ہوپی (Hopi) وغیرہ کو فنا کر دیا گیا۔ جب نسل ہی باقی نہ رہی تو زبان کے بچنے کا کیا سوال پیدا ہوتا۔ امریکی ریاست کیلی فورنیا جہاں زبانوں کے کئی بڑے گروہ پائے جاتے تھے وہاں سفاکی اور درندگی کا ایسا مظاہرہ کیا گیا کہ تاریخ نے اس ریاست کا نام جس کا مطلب ہسپانوی زبان میں "خوابناک سونے کی سرزمین" تھا، زبانوں کا قبرستان (Cemetery of Languages) رکھ دیا۔ جہاں سترہ بڑے لسانی گروہوں کی دو سو کے قریب زبانیں اور بولیاں بولی جاتی تھیں وہاں آج صرف دو زبانیں باقی رہ گئی ہیں۔ یہ تاریخ ساز کارنامے ان قوموں نے انجام دیے جنھیں اس بات پر فخر ہے کہ وہ دنیا میں انسانی حقوق کے سب سے بڑے علمبردار ہیں اور انسانیت کی جتنی خدمت انھوں نے انجام دی وہ خدمت کوئی اور انجام نہ دے سکا۔

اطالوی استعمار اور زبانیں:

اطالوی استعمار نے ایتھوپیا، صومالیہ، لیبیا پر قبضہ کیا۔ مقبوضات میں عربی رسم الخط کو ختم کر کے لاطینی رسم الخط جبراً نافذ کیا۔ لیبیا پر سرکاری زبان کے طور پر اطالوی زبان کا جبراً نفاذ کرایا گیا۔ ایتھوپیا کی زبان Amheric میں جبراً اطالوی الفاظ داخل کیے گئے۔ مگر یہ کوشش ناکام ہوئی۔ یہ افریقہ کی واحد سامی النسل زبان تھی جو محفوظ رہی۔ اب لیبیا میں عربی زبان نافذ ہے اطالوی زبان ختم ہو گئی۔ صومالیہ میں عربی اور صومالی زبانیں آج بھی موجود ہیں۔

زائرے (Zaire) پر بیلجیئم کا قبضہ ہو گیا۔ اس کا نام بلجیئن کانگو رکھا گیا اور یہاں کی زبان بھی تبدیل کر

دی گئی۔

فرانسیسی استعمار اور زبانیں:

الجزائر فرانس کی نوآبادیات تھا، زائر میں بنتو زبانیں ہوتو اور تمسی بولی جاتی تھیں لیکن جبراً یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی قرار دی گئی۔ الجزائر میں بھی فرانسیسی کو جبراً سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ پانڈیچری، مدغاسکر، سینی گال اور مغرب اقصی فرانس کی نوآبادیات بن گئیں۔ یہاں فرانسیسی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کو بھی زندہ رکھا گیا۔ براعظم افریقہ میں عربی کی آمیزش کے ساتھ جو فرانسیسی بولی جاتی ہے اسے خیپو (Cre pus) کہتے ہیں۔ یہاں پر فرانسیسی زبان نے عربی کا اثر قبول کیا۔

ولندیزی استعمار اور زبانیں:

ولندیزیوں نے انڈونیشیا پر قبضہ کیا تو وہاں کی زبان پر جبراً اثر انداز ہوئے۔ Bahasa کا رسم الخط عربی سے جبراً لاطینی میں تبدیل کیا گیا۔ بہاسا زبان ملایو پولی نیشیا اور سنسکرت زبان کا سنگم ہے۔ قبول اسلام کے بعد اس کا رسم الخط فطری طور پر عربی ہو گیا تھا۔

جاوا جزیرے کی بوگونی اور ربالیتی زبانوں کے خود ساختہ رسم الخط تھے۔ یہ جزیرے دو مختلف مذاہب بدھ مت ہندو مت اور ثقافتوں کے مراکز تھے۔ ولندیزی استعمار نے انھیں بھی جبراً تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ جزائر کیریبین پر ولندیزیوں کا قبضہ ہوا تو یہاں افریقی لوگوں کو بسایا گیا اور تا کی اور پولس موٹو زبان متعارف کر کے لاطینی زبان و رسم الخط کا نفاذ کیا گیا۔ ہالینڈ کے استعمار کا جنوبی افریقہ پر قبضہ رہا وہاں زولو اور سوتھو زبانیں بولی جاتی تھیں۔ ولندیزی، انگریزی اور جرمن الفاظ داخل کر کے اس کا نام بھی افریکانز کر دیا گیا۔ اب یہ ایک انڈو یوروپی زبان بن گئی ہے۔

ڈچ استعمار اور زبانیں:

ڈچ استعمار نے سوری نام (جنوبی امریکہ) پر قبضہ کیا تو اردو، ہندی، تامل زبانوں کا رسم الخط لاطینی کر دیا گیا اور اس ملک کا نام ہالینڈ نے ڈچ گیانا رکھا تھا جسے اب سوری نام میں بدل دیا گیا ہے۔

پرتگالی استعمار اور زبانیں:

پرتگالی استعمار گوا پر قابض ہوا۔ گوا بے جاپور ریاست کا حصہ تھی یہاں قبضے کے بعد کوئی زبان کے عربی رسم الخط کو ختم کر کے لاطینی رسم الخط نافذ کیا گیا۔ برازیل پر قبضہ کر کے وہاں بھی پرتگالی زبان جبراً رائج کی گئی۔

روسی استعمار اور زبانیں:

روسی استعماریت نے تمام مسلمان مقبوضات کے رسم الخط عربی سے سریلی (Cyrillic) میں تبدیل کر دیئے۔ ازبک اور ریغور زبانیں جن کا ادب ترک اقوام کا زریں ادب کہلاتا تھا انھیں دانستہ فراموش کر دیا گیا۔ لیکن عیسائی ریاستوں آرمینیا اور رجارجیا کے معاملے میں روسی استعمار نے مذہبی تفریق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کا قدیم رسم الخط برقرار رکھا کیوں کہ اس رسم الخط میں عیسائیوں کا صدیوں پرانا علمی و تحقیقی اور تاریخی و ثقافتی ورثہ محفوظ تھا۔ روس نے جارجیائی زبان کو ایک اور رسم الخط جسے ''مخط سوری'' کہتے ہیں لاگو کرنے کی آزادی اور اجازت دی جو سریلک رسم الخط سے انتہائی مختلف اور منفرد تھا۔ یہ فراخ دلی روسی استعمار نے عیسائیت کے لیے اختیار کی لیکن مسلمانوں کو اس فراخ دلی سے کوئی حصہ نہ مل سکا۔

زبانیں۔موت سے احیاء تک:

زبانیں صرف مرتی ہی نہیں ماری بھی جاتی ہیں، قتل بھی ہو جاتی ہیں، انھیں مٹا دیا جاتا ہے لیکن صفحۂ ہستی سے نہیں مٹایا جا سکتا، اگر زبان بولنے والوں کو اپنی زبان سے محبت ہو۔ عبرانی زبان کو مٹنے اور مٹانے کی ایک طویل تاریخ ہے لیکن اسے زندہ کرنے کی بھی ایک سنہری تاریخ ہے جو مٹنے والی زبان بولنے والوں کو ماتم کرنے اور گریاں کناں ہونے کے بجائے حوصلہ اور ہمت کی نئی کہانی سناتی ہے۔ کسی قوم اور ملت کے فرد میں اپنی زبان سے محبت کی ایک ننھی سی چنگاری بھی زندہ ہے تو یہ چنگاری کبھی بھی شعلہ بن سکتی ہے۔

عبرانی: مردہ زبان زندہ ہوتی ہے:

اسرائیلیوں نے اپنے محکم ایمان اور اپنے پیہم عمل کی بدولت اپنی مذہبی زبان عبرانی کو موت کے چنگل سے رہائی دلا کر نئی زندگی بخشی۔ ۱۹۴۸ء ہی میں عبرانی کو اسرائیل کی سرکاری زبان بنا دیا۔ صرف پانچ برس بعد ۱۹۵۳ء میں اسرائیلی پارلیمینٹ کے ایک فرمان (Act) کی رو سے عبرانی زبان کی مجلس کا درجہ بڑھا کر اسے اکادمی کا نام دے دیا۔[۴۳]

عبرانی: کیسے قتل ہوئی؟

عبرانی تقریباً ۲۳۰۰ سال تک یہودی عوام کی بول چال کی زبان تھی۔ اس کا زوال اس وقت شروع ہوا جب ۵۸۶ قبل مسیح میں بابل کے شہنشاہ نبوشاذنظر (Nebuchadnezzer) نے یروشلم فتح کیا۔ یہودیوں کے معبدِ اول (First Temple) کو تباہ کر دیا اور یہودیوں کی غالب آبادی کو غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ بابلی سلطنت عظمیٰ (Babylonian Empire) کی مروجہ، رسمی (formal) زبان آرامی (Aramaic) تھی جسے جلاوطنی میں یہودیوں نے اپنا لیا۔ اس طرح عبرانی یہودیوں کی بول چال کی زبان کے طور پر ختم ہونے

لگی۔ آرامی بھی ایک شمال مغربی سامی (Semitic) زبان ہے، جو عبرانی سے بہت مماثلت رکھتی ہے۔ چند عشروں (دہائیوں) کے بعد ایرانی شہنشاہ سائرس (Cyrus) نے بابلی سلطنت پر قبضہ کرلیا تو آرامی (Aramaic) زبان کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کیا۔[۴۴]

عبرانی کا تحفظ: ربی یہودا ہاناسی:

تقریباً سو سال بعد جب یہودی جلاوطنی کے بعد اپنے وطن واپس لوٹے تو ایرانی سلطنت کا حصہ ہونے اور آرامی زبان کے سرکاری زبان ہونے کی بنا پر انھیں خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں آرامی زبان عبرانی کی جگہ نہ لے لے۔ اس لیے ربی (امام) یہوداہاناسی (Yahuda Ha-Nasi) نے ۲۰۰ عیسوی میں تالمود کے احکامات کا مجموعہ مشناۃ مرتب کیا، یہودیوں کو اپنی زبان سے غفلت برتنے پر تنبیہہ کی۔ ربی یہودا گھر میں ہمیشہ اہتمام سے عبرانی زبان بولتے تھے۔ تالمود میں تحریر ہے کہ ان کی نوکرانی کو عبرانی پر اتنا عبور حاصل تھا کہ ان کے شاگردوں کو جب کوئی لفظ نہ آتا یا بھول جاتا تو اس سے پوچھا کرتے تھے۔[۴۵]

ادب و مذہب کی زبان:

۷۰ عیسوی میں یروشلم اور معبد دوم (Second Temple) کی تباہی کے بعد یہودی دنیا بھر کے ملکوں میں منتشر ہوگئے وہ جس ملک میں بھی گئے، اسی ملک کی زبان اپنالی۔ تاہم ان کی مذہبی اور ادبی (Literary) زبان عبرانی ہی رہی۔ یہودی مذہبی تعلیم کے دوران عبرانی سیکھتے رہے تاکہ وہ توریت اور تالمود، ترجمے کے بجائے اصل زبان میں پڑھ سکیں اور عبادت کے دوران دعاؤں کا مطلب سمجھ سکیں۔ اس رواج نے ایک طرف تو یہودیوں کو خواندہ اور علم دوست بنادیا، دوسری طرف انھیں بکھراؤ (Dispersion) کے دوران اکثریتی ثقافت میں جذب ہونے سے بچائے رکھا۔ اس طرح وہ دو ہزار سال تک دربدر رہنے کے باوجود اپنا نسلی، مذہبی اور ثقافتی تشخص برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔[۴۶]

عبرانی کا احیاء: آئی ایزر بن یہودا کے ذریعے:

تقریباً دو ہزار سال سے عبرانی محض ایک مذہبی اور کسی حد تک ادبی زبان ہو کر رہ گئی تھی۔ روزمرہ کی بول چال اور زندگی کے دیگر امور میں غیر مستعمل ہو کر نیم مردہ حالت میں تھی۔ انیسویں، بیسویں صدی میں اس کا فلسطین میں، جدید عبرانی کی شکل میں، ادب، سائنس غرض یہ کہ زندگی کے ہر شعبے میں دوبارہ جاری و ساری ہو جانا حیرت انگیز ہے۔ اس کا تمام تر سہرا آئی ایزر بن یہودا (Eliezer Ben-Yahuda) کے سر پر ہے۔ بن یہودا کو یہ بہت عجیب لگتا تھا کہ یہودی دنیا کی دیگر ۷۰ زبانیں تو بول سکتے ہیں، لیکن اپنی زبان عبرانی نہیں بول سکتے۔ یہ

آزمانے کے لیے کہ عبرانی میں بولے جانے اور احیاء کی صلاحیت ہے بھی یا نہیں، انھوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ عبرانی میں گفتگو کرنے کی کوشش کی فلسطین میں پہنچتے ہی انھوں نے عہد کرلیا کہ وہ کسی یہودی سے عبرانی کے سوا کسی اور زبان میں بات نہیں کریں گے۔[۴۷]

موت سے زندگی کا سفر: اتمر بن ابی پر تجربات:

۱۸۸۲ء میں جب ان کا پہلا بیٹا بن زائین بن یہودا (Ben Zion Ben-Yahuda) جسے عام طور پر اتمر بن ابی (Itamar Ben-Avi) کہا جاتا ہے، پیدا ہوا تو انھیں تجربہ کرنے کا ایک بہت اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ ایسے گھر میں، جہاں ہر وقت عبرانی بولی جاتی ہو، پلنے والا بچہ جب بولنا سیکھے گا تو وہ حالیہ تاریخ میں پہلا شخص ہوگا جس کی مادری زبان عبرانی ہوگی۔ یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہوگا کہ عبرانی زبان کا مکمل احیاء ممکن ہے۔ جیسا کہ بن یہوداہ نے اپنی شاہکار لغت (ڈکشنری) کے تعارف میں بھی لکھا "ہماری زبان جو بولی نہیں جاتی، اگر کسی فرد واحد کی زبان بن جائے تو پھر شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ پوری قوم کی بول چال کی زبان (Spoken Language) بھی بن سکتی ہے"۔

بن یہوداہ اور ان کا عبرانی بولنے والا خاندان لوگوں کے لیے عبرانی زبان کے احیاء کی علامت اور قابل رشک و تقلید مثال بن گئے۔ ان کے بیٹے اتمر بن ابی (Ittamar Ben-Avi) کی خودنوشت سوانح عمری کے مطابق بچے کی زبان کی روزمرہ ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بن یہوداہ نے مختلف چیزوں مثلاً گڑیا، آئس کریم، جیلی، آملیٹ، رومال، تولیہ، بائیسکل اور سینکڑوں دیگر اشیاء کے متبادل عبرانی نام اختراع کرنے شروع کر دیے۔ جوں جوں بچہ بڑا ہوتا چلا گیا اسی طرح عبرانی زبان ذخیرہ الفاظ اور اظہار کے فطری پن کے لحاظ سے ترقی کرتی چلی گئی۔ عبرانی زبان کے احیاء کے لیے انھوں نے جس اصول پر عمل کیا وہ تھا "عبرانی گھر میں"، "عبرانی سکول میں" اور "لفظ بلفظ اور عبرانی لفظ"۔[۴۸]

عبرانی: عربی سے نفرت:

عبرانی بولنے والے علماء اور خصوصاً یہودی علماء لسانیات کا یہ دعویٰ ہے کہ عربی عبرانی زبان کی جدید ترین شکل ہے اور عربی کے حروف تہجی اور ذخیرہ الفاظ عبرانی ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ عبرانی زبان کے احیاء کی جب تحریک شروع ہوئی تو اس وقت عبرانی زبان کا ذخیرہ الفاظ صرف آٹھ ہزار تھا اور بابائے عبرانی الی عیزر بن یہودا (Eliezer Ben Yehuda) کو بے شمار الفاظ خود تخلیق کرنے پڑے یا دنیا کی مختلف زبانوں سے وہ الفاظ انھوں نے اخذ کیے لیکن اسلام سے نفرت کے باعث عربی زبان کے الفاظ اور لغات کو نہ تو ترجیح دی گئی اور نہ ہی الفاظ کے انتخاب اور اخذ کے دوران عربی زبان پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس رویے کے پس پشت ایک تاریخی

عصبیت بھی ہے لیکن یہی عصبیت یہودی علمائے لسانیات کے اس دعوے کی تردید بھی کرتی ہے کہ عربی زبان عبرانی زبان ہی کا ایک جدید نمونہ ہے۔ اس تناظر میں علامہ شبلی نعمانی کا یہ دعویٰ درست نظر آتا ہے کہ عربی عبرانی سے زیادہ قدیم زبان ہے۔

دوسری زبانوں کے ذریعے عبرانی کی تعلیم:

جیسا کہ ۱۹۲۸ء میں اس وقت کے ایک استاد داؤد یودالے ویز David Yudeleviz نے لکھا ہے کہ ''لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ حالات کتنے مشکل تھے۔ کتابوں، سینکڑوں الفاظ، اسم، فعل اور محاورات نہ ہونے کے باوجود ہم نے پڑھانا شروع کر دیا۔ ہم نیم گونگوں کی طرح ہکلاتے ہوئے ہاتھوں اور آنکھوں کے اشاروں سے باتیں کرتے تھے''، ایک اور مشہور استاد داؤد ییلین (David Yellin) نے لکھا ''ہر استاد کے پاس عبرانی کے بجائے روسی یا فرانسیسی میں کتاب ہوتی تھی اور اسے عبرانی میں پڑھانے کا کام سرانجام دینا ہوتا تھا۔ درسی اصطلاحات موجود نہ تھیں۔ دیہاتی اسکولوں کا ہر استاد عبرانی زبان کی اکادمی کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ اپنی پسند اور ذوق کے مطابق الفاظ وضع کرتا اور اپنی ہی تخلیقات کو پڑھانے کے لیے استعمال کرتا۔ تاہم جوں جوں وقت گزرتا گیا، مسائل خود بخود حل ہوتے چلے گئے۔ ایک نوزائیدہ عبرانی بولنے والی نسل وجود میں آ گئی تو سب کو یقین ہو گیا کہ زبان کا احیاء کامیابی سے ہمکنار ہوگا''۔[۴۹]

سترہ جلدوں پر مشتمل تاریخی لغت:

بن یہودا کو عبرانی زبان کی کم مائیگی کا احساس اس وقت ہوا، جب انھوں نے پیرس میں اپنے دوستوں کے ساتھ عبرانی بولنے کی مشق شروع کی۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے انھوں نے نئے الفاظ وضع کر کے ان کی فہرستیں اخباروں میں چھاپنا شروع کر دیں۔ اس طرح انھوں نے غیر رسمی اور بے قاعدہ طور پر الفاظ سازی اور لغت نگاری کا آغاز اپنے پیرس کے قیام کے دوران کیا۔ لیکن انھوں نے ۱۹۱۰ء میں اپنی معرکتہ الآرا لغت باقاعدہ طور پر مرتب کرنا شروع کی۔ بن یہودا اٹھارہ، اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتے تھے۔ آخر کار ان کی طویل، محنت شاقہ رنگ لائی۔ ان کی مرتب کردہ، سترہ جلدوں پر مشتمل ''قدیم اور جدید عبرانی کی مکمل لغت (A Complete Dictionary of Ancient and Modern Hebrew) آج بھی عبرانی لغت نگاری (Hebrew Lexicograhphy) کی تاریخ میں یکتا تصور کی جاتی ہے۔

عبرانی زندہ ہو گئی:

ان کی زندگی ہی میں ایک مردم شماری (Census) کے دوران فلسطین کے ہر یہودی نے اپنی زبان عبرانی درج کی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عبرانی کہیں بھی یہودیوں کی روزمرہ کی زبان نہیں تھی اور مخصوص حالات

کے علاوہ بولی بھی نہیں جاتی تھی ۔اس لیے اگر یہ مردہ زبان نہیں تھی تو زندہ بھی نہیں تھی۔ غالبًا اسے "نیم مردہ" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔عبرانی کے احیاء میں بن یہودا کے کردار کے بارے میں سیمل روتھ (Semil Roth) کے ایک بلیغ مقولے کے مطابق "بن یہودا سے پہلے .....یہودی عبرانی بول (تو) سکتے تھے،لیکن اس کے بعد وہ واقعی بولنے لگے"۔[۵۰]

عبرانی کا سفر صرف آٹھ ہزار لفظوں سے شروع ہوا:

الفاظ سازی کے میدان میں عبرانی زبان کی مجلس (Hebrew Language Council) کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ عبرانی زبان کا ذخیرہ الفاظ ۸۰۰۰ سے بڑھ کر ۱۲۰۰۰۰ ہوگیا ہے۔ جے ایم پائینز (J.M. Pines) کے مطابق الفاظ سازی کے لیے مجلس کے ارکان اس راز سے بخوبی واقف تھے "کہ کسی نئے لفظ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ نیا نہ لگے"۔

اسرائیل کے اندر ۶ ملین یہودی اور ۲ ملین عرب عبرانی زبان بولتے ہیں۔فرانس میں ۵ ملین یہودی اور ۵ ملین اسرائیلی تارکین وطن جو زیادہ تر امریکا میں آباد ہیں، گھر میں عبرانی بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ ارجنٹائین،فرانس، جرمنی، کینیڈا، آسٹریلیا، روس، جنوبی افریقہ، یوکرین، برطانیہ، امریکہ میں جہاں یہودیوں کی خاصی بڑی آبادی ہے، خاص طور پر وہ جو کبھی اسرائیل نہیں گئے، نہ تو عبرانی بولتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔[۵۱]

عبرانی: علمی سفر:

عبرانی کو ذریعہ تعلیم بنانے سے اسرائیل میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا معیار گرا نہیں بلکہ اس وقت وہ ان میدانوں میں صف اول کی قوموں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں ایک اسرائیلی ادیب شموئیل یوسف اگنن (Shmuel Yousef Agnon) کو ادب میں نوبل انعام دیا گیا۔اس سال علم کیمیا (Chemistry) کا نوبل انعام مشترکہ طور پر دو اسرائیلی بائیو کیمسٹوں، ہارون سیچا نوور (Aaron Ciechanovar) اور ابرام ہرشکو (Avram Hershko) اور امریکا کے ارون روز (Irwin Rose) کو ملا ہے۔[۵۲]

ایران وہند: مذہبی دہشت گردی اور زبانیں:

ایران وہند میں ماگدھی سنسکرت ژند زبانوں پر کیا گزری اس کی تفصیل محمد حسین آزاد "آب حیات" میں بیان کرتے ہیں۔

اسی بنیاد پر فتیابوں کی بلند نظری نے اس کا نام سنسکرت رکھا۔جس کے معنی آراستہ، پیراستہ، منجھی ہوئی، منزہ، مصفا، مقدس، جو چاہے سمجھ لو۔ان کے قواعدِ زبان بھی ایسے مقدس ہوئے کہ بزرگانِ دین ہی اسے پڑھائیں تو

پڑھائیں، بلکہ اس طرح پکار کر پڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر کے کان میں آواز پڑے۔ اس زبان کا نام دیوبانی ہوا، یعنی زبانِ الٰہی، زبان شاہی وید کے منتر ترتیب، جس سے اس عہد کی زبان کا پتہ لگے۔ ۱۴ سو برس قبل سنہ عیسوی میں خیال کرتے ہیں۔ اس وقت ان قیاسیوں کی باتیں اس ملک اور ملک والوں کے ساتھ ایسی سمجھو جیسے ہندوستان میں پہلے پہلے مسلمانوں کی حالتیں، ان کے سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں میں آ کر کچھ اور ہو گئے ہوں گے۔ اس لیے گھروں اور بازاروں میں باتیں کرنے کو قطعے قطعے میں پراکرت زبانیں خود بخود پیدا ہو گئی ہوں گی۔ جیسے اسلام کے بعد اردو، چنانچہ ماگدھی (پالی) سورسینی، مہاراشٹری وغیرہ قدیمی پراکرتیں اب بھی اپنی قدامت کا پتا بتاتی ہیں۔ ان کی سیاہی میں سینکڑوں لفظ سنسکرت کے چمکتے نظر آتے ہیں۔ مگر بگڑے ہوئے ہیں۔

دیکھا! پرکت کے معنے ہیں۔ طبیعت اور جو طبیعت سے نکلے چنانچہ ہیم چند لغات سنسکرت کا جامع بھی یہی کہتا ہے۔ اس کے علاوہ سنسکرت مہذب او رمقدس اور پراکرت غیر مہذب لوگوں کو کہتے ہیں۔ پس ایسی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فہمیدہ لوگ تھے۔ ہر بات کو خوب سمجھتے تھے اور جو کچھ انھوں نے کیا سمجھ کر کیا۔

راجہ بھوج کے عہد کی ...... کہتی ہیں کہ ان عہدوں میں علمی، کتابی اور درباری زبان تو سنسکرت تھی۔ مگر چوں کہ معاملہ خاص و عام سے پڑتا ہے، اس لیے گفتگو میں پنڈتوں کو بھی پراکرت ہی بولنی پڑتی ہے۔ پراکرت صاف سنسکرت کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں ہزاروں لفظ سنسکرت کے ہیں اور ویسے ہی قاعدے صرف و نحو کے بھی ہیں۔

سنسکرت کی اتنی حفاظت ہوئی، پھر بھی متوسرتی ویدوں کی ترتیب سے کئی سو برس بعد لکھی گئی تھی۔ اس میں اور "وید" کی زبان میں صاف فرق ہے اور اب اور بھی زیادہ ہو گیا لیکن چوں کہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر مذہب کا چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس لیے نقصان کا بہت خطرہ نہ تھا کہ دفعتاً ۵۴۳ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی شاک منی پیدا ہوئے۔ وہ مگدھ دیس سے اٹھے تھے۔ اس لیے وہیں کی پراکرت میں وعظ شروع کیا۔ کیوں کہ زیادہ تر کام عوام سے تھا۔ عورت مرد سے لے کر بچے اور بوڑھے تک یہی اس دیس کی زبان تھی۔ ان کی آتش بیانی سے مذہب مذکور ایسا پھیلنا شروع ہوا۔ جیسے بن میں آگ لگے دیکھتے دیکھتے دھرم، حکومت، رسم و رواج، دین، آئین سب کو جلا کر خاک کر دیا اور مگدھ دیس کی پراکرت کل دربار اور کل دفتروں کی زبان ہو گئی۔ اقبال کی یاوری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہو کر اسی زبان میں علوم کے کتب خانے سج گئے اور فنون کے کارخانے جاری ہو گئے۔ کہیں کہیں کونے گوشے میں جہاں کے راجہ وید کو مانتے رہے۔ وہاں ویدوں کا اثر رہا۔ باقی راج دربار اور علمی سرکار سب ماگدھی ہی ماگدھی ہو گئی۔ ان کے حوصلے وسیع ہو کر دو بڑھے۔ اور با آواز بلند کہہ دیا کہ ابتدائے عالم سے تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے برہمن اور کل

انسان بات کرنے کے لائق بھی نہ تھے، اصل میں ان کی بھی اور رفادر مطلق بدھ کی زبان یہی ہے ۔اس کی صرف ونحو کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں ۔خدا کی قدرت دیکھو! جولونڈی تھی وہ رانی بن بیٹھی اور رانی منہ چھپا کر کونے میں بیٹھ گئی۔

زمانے نے اپنی عادت کے بموجب (تخمیناً ۱۵سو برس بعد) بدھ مذہب کو بھی رخصت کیا اور اس کے ساتھ اس کی زبان بھی رخصت ہوئی ۔شنکرا چارج کی برکت سے برہمنوں کا ستارہ ڈوبا ہوا پھر ابھر کر چمکا اور سنسکرت کی آب وتاب بھی شروع ہوئی ۔راجہ بکرماجیت کے عہد میں جو روشنی اس کی فصاحت نے پائی ۔آج تک لوگوں کو آنکھوں کا اجالا ہے ۔اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دربار سلطنت اور اعلیٰ درجے کے لوگوں کو سنسکرت بولنا اعتبار وافتخار کی سند تھا اور پراکرت عوام کی زبان تھی کیوں کہ اس عہد میں جو کالی داس ملک الشعراء نے شکنتلا کا ناٹک لکھا ہے سبھا میں دیکھ لو بادشاہ، امراء اور پنڈت سنسکرت بول رہا ہے کوئی عام آدمی کچھ کہتا تو پراکرت میں کہتا ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قلعے کی وہ زبان تھی ۔جسے ہم آج کی برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے ہیں ۔اس وقت بھی ہر قطعے میں اپنی اپنی بولی عام لوگوں کی حاجت روائی کرتی تھی اور سنسکرت تصنیفات اور خواص کی زبانوں کے لیے باعث برکت تھی کہ دفعتاً زمانے نے ایک اور رنگ بدلا ۔یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا ۔اس نے پھر ملک ومذہب کو نیا انقلاب دیا ۔اور اسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر دوڑنا شروع ہو گیا۔

سنسکرت اور اصل فارسی یعنی ژند داستا کی زبان ایرین کے رشتے سے ایک دادا کی اولاد ہیں ۔مگر زمانے کے اتفاق دیکھو کہ خدا جانے کے سو برس یا کے ہزار برس کی بچھڑی ہوئی بہنیں اس حالت سے آکر ملی ہیں کہ ایک دوسری کی شکل نہیں پہچان سکتی۔

ہندوستانی بہن کی کہانی تو سن چکے، اب ایرانی بہن کی داستان بھی سن لو ۔کہ اس پر وہاں کیا گزری۔ اوّل تو یہی قیاس کرو کہ اس ملک نے جو ایران نام پایا، شاید وہ لفظ ایرین ہی کی برکت ہو ۔پھر یہ بھی کچھ تھوڑے تعجب کا مقام نہیں کہ جس طرح ہندوستانی بہن پر وقت بوقت بدھ مت وغیرہ کے حادثے گزرے، اسی طرح اس پر بھی وہاں انقلاب پڑتے رہے ۔باوجود اس کے اب تک ہزاروں لفظ فارسی اور سنسکرت کے صاف ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔

ایرانی بہن جب اس ملک میں جا کر بسی ہوگی، اوّل تو مدت تک ان کے مذہب، رسم و رواج اور زبان جیسے تھے، ویسے ہی رہے ہوں گے ۔مگر اس زمانے کی کوئی تصنیف ہاتھ نہیں آئی ۔کچھ ٹوٹا پھوٹا پتا ملتا ہے تو

زرتشت کے وقت سے ملتا ہے، جسے آج تخمیناً ۲۴ سو برس ہوئے۔ اس نورانی موحد نے شعلۂ آتش کے پردے میں توحید کے مسئلے کو رواج دیا۔ مذہب مذکور نے سلطنت کے بازوؤں سے زور پکڑا اور ایران سے نکل کر دو سو برس کے قریب اطراف و جوانب کو دبا تا رہا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اٹھا اور ایشیا کے امن و امان کو تہ و بالا کر دیا۔

جو مصیبت بدھ کے ہاتھ سے بید شاستر پر پڑی تھی، وہاں وہی مصیبت ژند استا پر آئی۔ چناں چہ جس آگ نے زرتشت اور جاماسپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا جس کے آگے گشتاسپ نے تاج اتار کر رکھا۔ جس کی درگاہ میں اسفندیار نے گرز اور تلوار چڑھائی وہ یونان کے آب شمشیر سے بجھائی گئی اور آتش خانے راکھ ہو کر اُڑ گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ژند یا زند کے ورق ورق برباد کیے گئے اور ہزاروں کتابیں فلسفۂ الٰہی اور علوم و فنون کی تھیں کہ نابود ہو گئیں۔ جب کہ یونانیوں نے ملک پر غلبہ پایا تو زبان نے زبانوں پر بھی زور دکھایا ہو گا تھوڑے ہی دنوں میں پارتھیا والوں کا عمل دخل ہو گیا۔ وہ ایران، جسے ہزاروں برس سے ملک گیری کے نشان سلامی اتارتے تھے اور تہذیب و شائستگی اس کے دربار میں سر جھکاتے تھے پانچ سو برس تک ظفریابوں کے قبضے میں دبا رہا۔ اور ژند کی کتب مقدسہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کی گئیں۔

۲۰۰ء میں پھر تن بے جان میں سانس اور ساسانیوں کی تلواروں میں قدیمی اقبال نے چمک دکھائی۔ ان بادشاہوں نے ملک و مملکت کی قدامت کے ساتھ بجھے ہوئے مذہب کو بھی روشن کیا۔ گرے ہوئے آتش خانوں کو پھر اٹھایا اور جہاں جہاں سے پھٹے پُرانے اوراق پریشان ہاتھ آئے بہم پہنچائے۔ ان ہی کی کوششوں کی کمائی تھی، جو پھر ساڑھے چار سو برس بعد حملۂ اسلام کے قربان ہوئی، اس معاملے میں ہمیں نیک پارسیوں کا شکریہ نہ بھولنا چاہیے۔ کیوں کہ باوجود تباہی کے خانہ بربادی کے جو پرانا کاغذ کسی با اعتقاد کے آیا۔ وہ جان کے ساتھ ایمان کو بھی لیتا آیا کہ بندر سورت، گجرات وغیرہ ملکوں میں آج تک اسی نور سے آتش خانے روشن ہیں۔ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ ان تصنیفات کا بقیہ ہے جو ساسانیوں کے عہد میں ہوئیں کتب مذکور دونوں زبانوں کا لفظی اتفاق ہی نہیں ثابت کرتیں۔ بلکہ ان کے اتحاد و اعتقاد پر بھی شہادت دیتی ہیں۔ جو چار برن ہندوؤں میں وہی ایران میں تھے۔ اجرام آسمانی کی عظمت واجب تھی حیوانات بے آزار کا مارنا گناہ عظیم تھا تناسخ کا مسئلہ دونوں میں یکساں تھا۔ آتش، آب، خاک، باد، ابر، بجلی، گرج، ہوا وغیرہ وغیرہ اشیاء کے لیے ایک ایک دیوتا مانا ہوا تھا جس کے اظہار عظمت کے لیے خاص خاص طریقے تھے۔ یاد الٰہی کے زمزمے تھے جس کو وہ اپنی اصطلاح میں گاتھا کہتے تھے۔ یہ وہی لفظ ہے جس کے نام پر یہاں گیتا کتاب ہے کیوں کہ اس میں بھی یاد الٰہی کے گیت ہیں۔ فارسی مرتبہ کے چند الفاظ تمثیلاً لکھتا ہوں کہ سنسکرت سے ملتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی
بھراتر	برادر	پتر	پدر
دوہتر	دختر	پتر	پور
انگشٹ	انگشت	ماتر	مادر
پاؤ	پا	جانو	زانو
بھئے	بیم	بھار	بار
کشیا	خاشاک	بھوم	بوم
کھر	خر	اشو	اسپ

پاکستان میں کوئی زبان معدوم نہیں ہوئی:

تعلیمی، سائنسی و ثقافتی ادارۂ اقوامِ متحدہ (یونیسکو) نے اپنے اعداد و شمار میں پاکستان میں موجود تمام زبانوں کو زندہ رہنے والی زبانیں قرار دیا ہے۔ اس زندگی کی وجوہات اس خطے کی تاریخ، تہذیب، روایات اور مذہبیت میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ پاکستان سمیت ایشیا کے تمام خطوں میں زبانوں کے مرنے اور مٹنے کی رفتار دوسرے تمام خطوں کے مقابلے میں بہت کم ہے کیونکہ ایشیا گہوارہ مذاہب ہے۔ مذاہب خاندان کی سرپرستی کرتے ہیں اور خاندان زبان کی سرپرستی کرتا ہے۔ پاکستان میں کوئی زبان معدوم نہیں ہوئی بلکہ اپنے اپنے دائرہ اثر میں بولی سمجھی اور استعمال کی جا رہی ہیں۔ اردو پاکستان میں رابطے کی زبان کے طور پر رائج ہے اور اس کے بولنے والے یہاں کی کل آبادی کا صرف ۸ فیصد ہیں لیکن ملک کے تقریباً تمام حصوں میں یہ زبان ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج ہے اور دوسری زبانوں کے بولنے والے اسے پہلی زبان یا مادری زبان کے طور پر بھی اپنا رہے ہیں۔

پاکستان میں تقریباً ۵۸ زبانیں بولی جاتی ہیں اور یہ تمام زبانیں زندہ ہیں جب کہ ان ۵۸ زبانوں میں بلوچی کے مزید ۲ لہجے، ہندکو کا ایک لہجہ، کوہلی ۲، پشتو ۲، شنا اور سندھی کے ایک ایک لہجے کو شامل نہیں کیا گیا۔ ان زبانوں کے علاوہ اس فہرست میں انگریزی، اردو اور گجراتی شامل نہیں ہیں، ان تمام زبانوں کو شامل کر لیا جائے تو زبانوں کی یہ تعداد ۶۹ بن جاتی ہے۔ پاکستان میں کچھ زبانیں ایسی بھی ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ ایسی زبانوں کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

۱۔ اوشوجو (Ushojo): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ ہے یہ لوگ زیادہ تر سوات کے اطراف جوانب میں بستے ہیں۔ یہ زبان ساوی سے ملتی جلتی ہے اور ہند آریائی خاندان کی دردا شاخ سے اس کا تعلق ہے۔

۲۔ آئر (Aer): اس زبان کے بولنے والے تیزی سے کم ہو رہے ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً ۱۵۰ سے ۲۰۰ تک ہے۔ یہ زبان جنوب مشرقی سندھ میں حیدرآباد، کھری اور بھارتی ریاست گجرات سے ملحقہ علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ چوں کہ اس زبان کے بولنے والے ہندو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اس وجہ سے زیادہ تر لوگ ریاست گجرات نقل مکانی کر گئے جہاں پر انھیں گجراتی زبان کا عتاب جھیلنا پڑ رہا ہے۔ اگر گجراتی سے بچتے ہیں تو ہندی اژدھے کی مانند منہ کھولے کھڑی ہے۔ مگر سندھ میں دیگر کئی مماثل زبانوں کے بیچ یہ زبان زندہ ہے اگر اسے بچانے کی کوشش نہیں کی گئی تو اندیشہ ہے کہ یہ زبان چند سالوں میں فنا ہو جائے گی۔ اس زبان کا تعلق ہند آریائی خاندان سے ہے اور یہ زبان سندھی اور گجراتی زبانوں سے بھی ملتی ہے۔

۳۔ بھایا (Bhaya): جنوبی سندھ کی یہ زبان بولنے والے آج صرف ۵۰۰ یا اس سے کچھ کم ہیں۔ یہ زبان کھپرو، میر پور خاص اور حیدرآباد میں بولی جاتی ہے۔ تقسیم نے اس زبان پر بھی کاری ضرب لگائی۔ اس زبان کے بولنے والے کافی تعداد میں اب بھارت جا چکے ہیں۔ اس کا لسانی تعلق ہند آریائی خاندان سے ہے۔

۴۔ ڈوماکی (Domaki): پانچ سو کے قریب لوگ اس زبان کو بولتے ہیں۔ یہ زبان گلگت، نگر اور شمالی علاقہ جات کے کچھ اور علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ یہ زبان شینا زبان سے کافی ملتی ہے اور اس کا تعلق ہند آریائی کی دردا شاخ سے ہے۔

۴۔ ساوی (Savi): یہ زبان سفر در سفر کی وجہ سے مٹ رہی ہے۔ روس کی افغانستان میں مداخلت سے یہ لوگ پاکستان و ایران ہجرت کر گئے۔ کچھ لوگ پاکستان میں صوبہ سرحد کے علاقے تیمر گرہ اور دروش کے مہاجر کیمپ میں بس گئے بعد ازاں کچھ لوگ واپس افغانستان چلے گئے اور کچھ لوگ پاکستان میں اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ ان لوگوں کی تعداد چند سو ہے۔ اس زبان کا تعلق ہند آریائی کی دردا شاخ سے ہے۔

۵۔ کبوترا (Kabutra): عمر کوٹ، نارو ڈھورو، کھری اور جنوبی سندھ کے بھارت سے ملحقہ سرحدی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ آج اس کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار ہے جو ہندو دھرم کے ماننے والے ہیں۔ اس زبان کے بولنے والوں کی زیادہ تعداد گجرات اور راجستھان میں بستی ہے۔ تھر میں خشک سالی کے سبب یہ لوگ حیدرآباد اور کراچی منتقل ہوتے رہتے ہیں، کچھ لوگ تو واپس پلٹ جاتے ہیں اور کچھ لوگ کراچی کی زندگی (بشمول زبان و مذہب) اختیار کر لیتے ہیں۔

۶۔ گوڑو (Gowro): صوبہ سرحد میں دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو سو ہے اس کا تعلق ہند آریائی خاندان کی دردا شاخ سے ہے۔

پاکستان میں یہ تمام زبانیں بولی تو جاتی ہیں لیکن لکھی پڑھی نہیں جاتیں۔ بول چال کے لیے دوسری

زبان بولنے والوں سے ان کے روابط بھی محدود ہیں اس وجہ سے ان کے معدوم ہونے کا خطرہ ہے۔

بھارت میں زبانوں کی صورت حال:

ایشیا میں بھارت ایسا ملک ہے جہاں تقریباً ۴۰۰ زبانیں بولی جاتی ہیں اور اقوامِ متحدہ کے تعلیمی، سائنسی و ثقافتی ادارے کی رپورٹ میں جو زبانیں ابھی تک معلوم ہو سکیں ان کی تعداد ۳۶۰ ہے جن میں سے گیارہ کے قریب زبانیں مر چکی ہیں اور دیگر زبانوں کے مرنے کے بھی امکانات ہیں۔ اس ملک میں زبانوں، ثقافتوں اور مذاہب کو کچلنے کا عمل تاریخ کے ہر دور میں ملتا ہے جب آریہ حملہ آور قدیم سندھی تہذیب اور اس کی زبان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا سبب بنے، پھر جب شمالی ہند میں یہ حملہ آور داخل ہوئے تو مقامی آبادی کو جنوب میں دھکیلا اور وہاں کی زبانوں کو بیخ جان کر حوصلہ شکنی کی۔ بدھ مت کو طاقت کے بل پر مٹانے کے بعد انھوں نے ان کی قدیم زبان پالی کو کچلا اور سنسکرت کو دوبارہ رائج کیا۔ یہی رویہ جین دھرم اور اس کی پراکرت زبان کے ساتھ بھی اختیار کیا گیا۔

بھارت: گیارہ معدوم زبانیں:

بھارت کی گیارہ معدوم زبانوں میں سے نو کا تعلق جزائر انڈمان سے ہے جبکہ دو زبانیں بھارتی سرزمین سے تعلق رکھتی ہیں۔ پالی زبان جو معدوم ہو چکی ہے اس کا سبب مذہبی دہشت گردی تھا۔ اس زبان میں بدھ مذہب کی مقدس کتابیں اور احکامات تھے لہٰذا برہمنیت نے اس زبان سے عناد برتا اور جب بودھ لوگوں کا نسلی قتلِ عام ہوا تو یہ لوگ بھارت کے اطراف کے ملکوں میں منتقل ہو گئے اور اس طرح یہ زبان فنا ہو گئی۔ آج سری لنکا اور برما (موجودہ میانمہ) میں بودھ بھکشو یہ زبان صرف دینی تعلیم کی غرض سے سیکھتے ہیں۔ تائی اہُم (Ahom) بھارت کی مشرقی ریاست آسام اور اس سے ملحقہ علاقوں میں بولی جاتی تھی لیکن آج یہ ختم ہو چکی ہے۔ جزائر انڈمان کی زبانیں جو ختم ہو گئیں ان کے نام یہ ہیں: اکابیا، اکابو، اکاکاری، اکاجیرو، اکاکیدے، اکاکول، اکاکورا، اکرپالے، اور اوکوجوائے۔

سنسکرت زبان بھی فنا ہو گئی تھی لیکن مذہبی تعصب اور تفاخر نے اسے پھر سے زندہ کر دیا۔ یہ زبان جو کبھی دھرم شالاؤں اور جوگی سنیاسیوں تک محدود ہو گئی تھی اب اس کے بولنے والوں کی تعداد ۱۹۸۱ء کے شمار کے مطابق تقریباً ۶۱۰۶ ہے۔

بھارت دیس میں آج بھی ہندو استعماریت (Hindu Hegemony) اپنے عروج پر ہے جس کے تحت وہاں کی تمام زبانوں کو سنسکرت کے رنگ میں رنگا جا رہا ہے۔ جس کے باعث زبانیں اپنی انفرادیت کھوتی جا رہی ہیں۔

زعفرانیت کا اثر: تامل ناڈو کا ردِ عمل:

بھارت کی منڈا خاندان کی زبانیں سنسکرت کا اثر نہیں رکھتی تھیں لیکن انھیں اس رنگ میں رنگ دیا گیا ہے۔ اسی طرح دراوڑ خاندان کی زبانیں بھی سنسکرت اثرات سے پاک تھیں لیکن انھیں بھی زعفرانیت (Safronization) کا لبادہ پہنا دیا گیا اور اس کی بہترین مثال تیلگو زبان ہے۔ Safronization کی اصطلاح Safron یعنی زعفران سے بنی ہے، چوں کہ ہندو مذہب کا یہ مقدس رنگ ہے اور تمام ہندو جوگی، سنیاسی اسی رنگ کے لباسوں میں ملبوس ہوتے ہیں لہٰذا مغرب نے "ہندو" رنگ دینے کے عمل کو اس اصطلاح سے مشتق کیا ہے۔ ہندو مورخین یہ تاثر پیش کرنا چاہتے ہیں کہ سنسکرت وسطی یا شمالی ایشیا سے نہیں آئی بلکہ اس کی تخلیق اسی خاک سے ہوئی ہے۔ تامل اور اردو زبانیں بھارت کی ایسی زبانیں ہیں جن میں سنسکرت کے اثرات دوسری تمام زبانوں سے بہت کم ہیں۔ اردو زبان پر پھر بھی سنسکرت کا کچھ اثر ضرور رہے اور اس کے الفاظ میں سنسکرت کے الفاظ شامل ہیں۔ ادی دراویڑا (بڑی دراوڑ) کہلانے والی تامل زبان آج تک خود کو سنسکرتی الفاظ سے پاک کرنے اور اپنی اصلیت کی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔ اس وجہ سے تامل زبان کو ضدِ ہندوئیت کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے اور اسے دبانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ تمل آج اپنی انفرادیت اور اہمیت کی وجہ سے سری لنکا، ملیشیا اور سنگاپور کی سرکاری زبان ہے لیکن اسے بھارت میں سرکاری زبان کی حیثیت نہیں دی گئی ہے بلکہ اسے صرف صوبائی سطح تک محدود رکھا گیا ہے۔ جب کہ تمل ادب ہندی ادب کی بہ نسبت مضبوط اور قدیم ترین ہے۔

تمل زبان سے عناد کے باعث تامل ناڈو میں ہندوئیت، زعفرانیت اور سنسکرت سے نفرت میں اضافہ اب شدید مخاصمانہ رویے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ سنسکرت سے ایسی نفرت اور اس کی اتنی شدید مخالفت کسی اور صوبے میں نہیں پائی جاتی کہیں اور نہیں ملتی۔ یہاں پر ہندی سے نفرت پائی جاتی ہے لیکن اسی سے مماثل زبان اردو کو سرکاری سرپرستی حاصل رہی ہے۔ مردم شماری کے فارم میں ہندی کا کوئی خانہ نہیں ہے بلکہ اردو کے اعداد و شمار ملتے ہیں۔ صوبے میں ۴ فیصد سے زیادہ لوگ اردو بولتے ہیں جب کہ ۱۹۴۷ء تک یہاں پر دو فیصد سے کچھ کم اردو بولنے والوں کی تعداد تھی۔

سنسکرت ثقافت کو تمل بھاشی ایک "غیر ملکی ثقافت" جب کہ ہندو مذہب کو "مسلط کیا گیا عقیدہ" کہتے رہے ہیں۔ اس نظریے نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ ۱۹۶۱ء میں ۳۴ ہزار تمل ہندوؤں نے ہندو مذہب ترک کر دیا اور ملحد بن گئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۹۰ء میں انا دُرائے تک جاری رہا جو ناستک نادا د (لامذہبیت) کا رہنما تھا۔ اس کے دور میں سری گنیش کے پتلوں کو چوراہے پر توڑا گیا اور سری رام پوجا کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ بھارت میں زبانوں کے گلا گھونٹنے کے عوامل میں مذہب اور سیاست کا ہمیشہ سے براہ راست تعلق ہے۔ یہاں تمل اور اردو زبانوں کی

مثال اس لیے دی جارہی ہے کہ ان دو بڑی زبانوں کی بھارت میں حیثیت کے سرسری جائزے سے ہی یہاں کی تمام زبانوں کے عروج و زوال کا ایک نقشہ ذہن میں آجاتا ہے۔

شمالی ہند کے ہندی اردو علاقے میں تمل کو اس لیے بھی پسند نہیں کیا جاتا کہ وہ ہندی کو قومی زبان بنانے کے خلاف تھے اور یہ کہ اس بھارتی زبان میں سنسکرت الفاظ کا ذخیرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

بھارت میں اردو زبان:

کچھ یہی حال بھارت میں اردو کا ہے۔ یہ زبان ترک اور منگول (مغل) حکمرانوں کے لسانی اور ثقافتی اثرات کا نتیجہ ہے جو اس عہد کی دو بڑی زبانوں کھڑی بولی اور برج بھاشا (بھاکا) پر پڑے۔ نتیجتاً ایک ایسی زبان کا ظہور ہوا جس کے الفاظ کا دائرہ اتنا وسیع ہوگیا کہ اس کے مقابلے پر بھارت کی کوئی زبان نہ ٹھہر سکی۔ ان ترکوں نے اپنی مادری ترکائی زبانوں (ازبکی، قزاق، ترکمانی، قلماق، کرغیزی) کو اپنے گھروں تک محدود رکھا اور فارسی زبان کو جسے وہ مذہبی تعلیمات حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے مقدم رکھا اور درباری زبان کا درجہ دیا۔ اس طرح ان کی اپنی مادری زبانوں بشمول فارسی اور عربی زبان نے برج بھاشا اور کھڑی بولی پر اثرات چھوڑے اور بھارتی تاریخ نے سنسکرت کے بعد ایک عظیم الشان زبان کو ظہور پذیر ہوتے دیکھا۔ قدیم ہندو ترک وطن کے کبھی قائل نہیں تھے اور دوسری اقوام کے متواتر حملوں کے باوجود بھی وہ اپنی تہذیب کی حفاظت کی اپنی سی کوشش کرتے رہے اور حملہ آوروں کو غیر ملکی، ناپاک اور کم ذات جانا۔ لہٰذا جب ان ترکوں نے اپنی زبان کے اثرات مقامی زبانوں پر ڈالے اور الفاظ کی ایک نئی فہرست کے ساتھ اسی ایک پرانی زبان نے جس میں مشرق وسطیٰ کی سامی النسل زبان عربی، مغربی ایشیا کی ہند ایرانی زبان فارسی اور وسطی ایشیا کی التائی زبانیں منگول، ازبکی، قزاقی، ترکمانی وغیرہ کے اثرات اور خوبیاں شامل ہوگئی تھیں ارتقا کی نئی منازل طے کیں۔

سنسکرت: حملہ آوروں کی زبان:

ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق ''جو زبانیں اچھی زبانوں سے پیدا ہوتی ہیں وہ شاہ نہیں تو شہزادیاں ضرور ہیں، خوش قسمت ہے وہ شہزادی جو نجیب الطرفین ہو۔ باپ بھی کہیں کا سلطان اور ماں بھی کہیں کی حکمران رہی ہو۔ اردو کی ماں سنسکرت اور باپ عربی سمجھے جاسکتے ہیں''۔ ہندو مورخین اس نئی زبان کو اپنانے کے لیے آنا کانی کرنے لگے اور اس زبان کو دیسی زبان تسلیم نہ کیا اسے بھی ودیش کہہ کر ''دیش نکالا'' کی فہرست میں ڈال دیا اور ہمیشہ اسے مسلمانوں اور باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی زبان جانا۔ سنسکرت بھی باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی زبان تھی لیکن ہندو مورخین اسے باہر سے آئی ہوئی زبان تسلیم کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ یہاں ہندو ذہنیت کا مقصد تاریخ کی اس حقیقت کو جھٹلانا ہے جس کے مطابق بھارت کی دھرتی ہمیشہ سے حملہ آوروں کی آماج گاہ رہی ہے اور ان آ کر

متغر کاریوں [حملہ آوروں] میں سنسکرت بولنے والے سرفہرست ہیں کیوں کہ ان آ کر متغر کاریوں سے پہلے یہاں پر منڈا اور دراوڑ زبانوں کا راج تھا۔ اگر سنسکرت زبان کو ہم حملہ آوروں کی زبان تصور کرتے ہیں تو ہندو دھرم کی بنیاد کو شدید دھچکا لگتا ہے اور سوال یہ اٹھتا ہے کہ سنسکرت بولنے والوں کا مذہب کیا تھا؟ کیا ان سنسکرت بولنے والوں نے بھارت کے مقامی مذاہب اور زبانوں کا گلا گھونٹا اور انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ کیا یہ مذہب دینِ اسلام کی طرح مغرب یا شمال کی طرف سے آیا؟ اگر ایسا ہے تو پھر اسلام پر انگلی اٹھانے والے ہندو خود اپنے لیے سوالیہ نشان بن جاتے ہیں۔

یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ مقامی لوگوں کا دھرم بھرشٹ [برباد کی مذہب] کیوں کیا گیا جس کے نتیجے میں ان کی ثقافت اور زبانوں کو برباد کیا گیا اور ان کی زبانوں کو حقیر القاب سے نوازا گیا، کبھی ناگ باتی، اشور بھاشا اور پراکرت (قدرتی یا خودرو)۔ جب کہ اپنی زبان کو خداؤں کی بھتی والی زبان (دیواوامریں) "متمدن زبان" (سنسکرت) اور اپنے رسم الخط کو "دیبوں کی دھرتی والا" (دیوناگری) نام دیا گیا۔

آج بھی بھارت کی تمام زبانوں میں مخصوص اصطلاحات سنسکرت زبان کے باعث یکساں ہیں لیکن تمل او ر اردو میں الگ الگ۔ اردو نے تو پھر بھی سنسکرت کو اپنے رنگ ڈھنگ سے اپنایا ہے اور آج بھی اردو میں الفاظ کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے جو سنسکرت کی نام نہاد جانشین ہندی میں بھی مستعمل نہیں ایسے الفاظ کی ایک مفصل فہرست جریدہ ۴۸ کے مضمون میں دی گئی ہے ایسے الفاظ کی چند مثالیں یہاں پیش کرنا مناسب رہے گا: مندر کو اردو (دکھنی) میں دیول (سنسکرت: دیوالے) یعنی دیو کا گھر کہتے ہیں، تمل میں "کرڑی" بولتے ہیں جو دراوڑی لفظ ہے جب کہ ہندی میں مندر کہتے ہیں۔ اسی طرح بھارت میں اردو کا سب سے زیادہ بکنے والا اخبار "ہند سماچار" ہے۔ بھارت کے بہت سے علاقوں میں اردو اور پنجابی میں اتوار کو "ویوار" کہتے ہیں جب کہ اتوار از خود سنسکرت نام ہے (سنسکرت: ادتیوار) یعنی سورج کا دن جب کہ ہندی میں "رشی وار" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

بھارت میں کشمیری زبان کو ہجرت اور مذہب کے نام پر جوکھم میں ڈال دیا گیا ہے۔ ہندو لوگ اس زبان کو دیوناگری میں لکھتے ہیں جب کہ مسلمان تحریر کے لیے عربی/اردو رسم الخط کو ترجیح دیتے ہیں۔ کشمیر کی گھاٹی کے انتہائی شمال میں لداخ کے علاقے میں بودھ مذہب کے پیروکار رہتے ہیں جن کی زبان تبتی ہے۔ یہ لوگ معاش کی تلاش میں کشمیر یا دہلی آتے جاتے رہتے ہیں جہاں ان کو اردو یا ہندی سے واسطہ رہتا ہے مزید یہ کہ حکومتِ کشمیر تبتی زبان کی سرپرستی نہیں کرتی اور اسکولوں میں اردو رائج ہے، اس طرح نئی نسل اردو پڑھتی ہے لیکن تبتی بولتی ہے۔ بھارت سرکار نے بھی تبتی زبان کی ترقی کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔ حالانکہ یہاں اس زبان کے بولنے والے تقریباً ایک لاکھ ۲۴ ہزار اردو سواسی ہیں اور دھرم شالا (ریاستِ ہماچل پردیش) ان کا ایک اہم شہر بن چکا ہے۔

نقل مکانی: زبان کا خاتمہ:

وسطی بھارت کے بندھیا چل کے پہاڑی علاقوں میں دراوڑی اور قدیم زبانیں موجود ہیں یہ لوگ تیزی سے ترک وطن کر کے بڑے شہروں کی طرف، روزگار کے لیے نقل مکانی کر رہے ہیں یہ منتقلی ان کی زبانوں کی بربادی اور معدومی کا سبب بنے گی۔ آندھرا پردیش میں تیلگو اور اردو اور مدھیہ پردیش میں اردو اور ہندی رائج ہیں اور دیگر چھوٹی زبانوں مثلاً سنتھالی، گونڈی وغیرہ کی سرکاری حوصلہ افزائی نہیں کی جارہی۔ بھارت ان زبانوں کی جنم بھومی ہے لیکن یہاں یہ زبانیں اجنبی بن گئی ہیں منڈا خاندان کی یہ زبانیں اپنی زمین کھو رہی ہیں جب کہ اسی خاندان کی دیگر زبانیں مشرقی ایشیا میں پھل پھول رہی ہیں۔

سنتھالی زبان وسطی بھارت کی بڑی اہم زبان ہے اور یہ منڈا خاندان کی بھی بڑی اور اہم زبان ہے۔ ۱۹۹۷ء کے شمار کے مطابق اس زبان کے بولنے والے ۵۹ لاکھ ۵۹ ہزار ہیں لیکن انھیں سرکاری سرپرستی حاصل نہیں۔ لیکن بھارت میں ریاست جھارکھنڈ کے قیام سے اس اہم زبان کی ترقی اور ترویج کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ منڈا خاندان کی اس اہم ترین زبان پر جو جنوبی ایشیائی زبانوں کی لسانیاتی تحقیق میں انتہائی مدد و معاون ہے، تحقیق کا کام نہیں کیا گیا اور اس کے تحفظ کے لیے ٹھوس اقدامات نہ کیے گئے تو یہ زبان آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔

چین میں زبانیں۔خطرات امکانات:

چین دنیا کا سب سے گنجان اور کثیر آبادی والا ملک ہے جس کا سرکاری نام "جونگھوا رین من گونگھے گو او" یعنی عوامی جمہوریہ چین ہے جو اپنے اندر زبانوں کا سمندر سموئے ہوئے ہے۔ یونیسکو نے ابھی تک ۲۰۲ زبانوں کی گنتی مکمل کر کے اسے فہرست میں شامل کیا ہے جن میں سے صرف ایک زبان کی موت واقع ہوئی ہے۔

چین صدیوں سے کثیر اللسان ملک رہا ہے۔ یہاں کے تین روایتی مذاہب نے چینیوں کی سوچ، فکر، رنگ ڈھنگ اور زبانوں میں ایک یگانگت قائم کی ہوئی ہے۔ بدھ مت، ہندوستان سے نکل کر وسطی ایشیا اور نیپال اور برما کے راستے چین پہنچا لیکن یہاں کے رنگ میں خود کو رنگنے کے بعد کنفیوشس مت اور داؤ مت کے ساتھ چین کے ہر میدان عمل میں پیش پیش رہا۔ چین کی تقریباً تمام زبانوں میں بدھ مت کی تحریریں ملتی ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چین کی سبھی زبانیں لکھی اور پڑھی جاتی رہی ہیں۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ مذہبی کتب کے باعث ہر زبان میں مذہبی تعلیمات کا سلسلہ جاری رہا اس طرح زبان قائم بھی رہی اور محفوظ بھی۔ کنفیوشس نے کئی مقدس کتابیں چھوڑی ہیں جو یہ ہیں: Wu Ching, I Ching, Shih Ching, Shu Ching, Li Chi, Ch'un Ch'iu یہ تمام کتب بہت ضخیم ہیں لہٰذا ان تمام کتب کا ترجمہ اور پھر اس زبان میں ادب کی دیگر اصناف کا ہونا کسی زبان کو کیسے معدوم کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ داؤ مت (تاؤ مت) کے مقدس صحیفے تاؤتے

کیا نگ (Tao-te-Kiang) اور لاؤ تزے (Lao Tzu) بھی چین کی تقریباً تمام زبانوں میں موجود ہیں۔ چوں کہ چینیوں کا ذوق ہر میدان میں اعلیٰ رہا ہے چاہے وہ کھانے ہوں یا طب، یا مذہب یا ثقافت، لہٰذا وہ اپنی زبانوں کی طرف سے کیسے لاتعلق رہ سکتے تھے۔

چین: جرچن زبان کا خاتمہ:

چین کی کل ۲۰۲ زبانوں میں سے ۲۰۱ زبانیں زندہ ہیں جب کہ صرف ایک زبان معدومی کا شکار ہوئی۔ جس کا نام جُرچن (Jurchen) ہے اور یہ زبان التائی منگول اور ترکائی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ترکوں کی اس زبان کی خاصیت یہ تھی کہ یہ ترکائی لسانی گروہ کی واحد زبان تھی جو چینی طرز تحریر میں لکھی جاتی تھی۔ اس کی معدومی کی اصل وجہ تو معلوم نہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ ترک ہمیشہ جنگجو رہے ہیں اور صحرا نوردی ان کے خون میں شامل ہے یہ لوگ شمال مشرقی چین کے منچوریہ صوبے سے نکل کر پڑوسی ریاست کھیتان (Khitan) پر حملہ آور ہوئے اور وہاں کے رسم الخط کو اپنا لیا اور اپنا آبائی رسم الخط فراموش کر دیا اور وہاں کی بود و باش کو اختیار کر لی جب کہ کھیتان زبان بھی اب مفقود ہو چکی ہے۔ منچوریہ میں بسنے والے جرچن قبائل میں ۱۵۹۹ء میں جرچن رسم الخط کا استعمال ختم ہو گیا۔ اس کی معدومی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ لوگ نقل مکانی کر کے منگولیا، سائبیریا یا پھر ترکستان چلے گئے ہوں گے جہاں پر مماثل اقوام میں مل کر یہ اپنی شناخت کھو چکے ہوں۔ یہ منچو زبان معدوم تو ہوئی لیکن اس معدوم شدہ زبان کی باقیات اس کے ایک بچے ہوئے لہجے کی صورت میں آج بھی بولی، لکھی اور سمجھی جا رہی ہے۔ یہ لہجہ جو آج ایک زبان کی حیثیت اختیار کر چکا ہے سی بو (Sibo) ہے جو آج بھی ۴۰ ہزار لوگوں کے ساتھ زندہ ہے۔

چین کی زیادہ تر زبانوں میں طرز تحریر یا رسم الخط میں یگانگت پائی جاتی ہے۔ لیکن ہر زبان نے اپنی اپنی ضروریات کے تحت تغیر و تبدل کے اصولوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ چینی زبان کا دشوار ترین انداز تحریر بھی اس تبدیلی کا ایک اہم سبب ہو سکتا ہے۔ چینی زبان کا معیاری لہجہ "منڈارین" یا معیاری بیجنگ (Mandarin, Standard Beijing) کہلاتا ہے۔ چینی زبان کے کئی اہم لہجے ہیں اور تمام لہجوں کو Character میں کچھ تغیر کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ شنگھائی کا لہجہ وو (Wu) کہلاتا ہے جو بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس لہجے میں کنگفوصت کی مقدس کتابیں وو چنگ (Wu Ching) اور (Shih) اور (Shu) وغیرہ موجود ہیں۔ جنوب مشرق میں کن تونی (Cantonese) لہجہ ہے جس میں بھی کنگفوصت کے قدیم ترین مقدس صحیفے موجود ہیں۔ نیز اس مذہب کی مقدس کتابیں سب سے پہلے اس زبان میں لکھی گئیں۔ چونکہ حکیم کنگفوتسے (کنفوشیس Confucius لاطینی میں) نے انسانی رشتوں کی حیثیت اور رعایا کے رعایا سے تعلق پر بہت زور دیا تھا اور ان

کے تمام احکامات اور فرمودات کو چین کی تقریباً تمام زبانوں میں ضبط تحریر کیا گیا ہے۔

چین کو لسانی اور رسم الخط کے اعتبار سے چار جغرافیائی حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا حصہ ہے مشرق کا، جو شمالی ساحلی پٹی سے شروع ہو کر جنوب میں ہانگ کانگ اور مکاؤ تک جاتا ہے یہاں پر چینی زبان اپنے قدیم رواجی رسم الخط (کچھ جگہوں میں تغیر و تبدل) کے ساتھ مروج ہے۔ جنوبی چین، یہ علاقے اقلیتی نسلوں کے علاقے کہلاتے ہیں جہاں پر مقامی مذاہب اور بودھ مذہب کے ہنایان (Hinayana) اور تھیرواڈ (Theravada) فرقوں کے لوگ بستے ہیں جن کے رسم الخط ملحقہ سرحدی ممالک سے ملتے ہیں۔ مغربی حصہ ترک نسل کی اقوام سے بسا ہوا ہے جہاں اُئی غُر (Uighur) ترک قوم دیگر اقوام پر اپنا ثقافتی اور لسانی اثر جمائے ہوئے ہے۔ یہاں کا رسم الخط عربی/فارسی ہے۔ شمالی چین میں جو روس اور منگول جمہوریہ سے ملحقہ علاقے ہیں وہاں سرلِی رسم الخط (Cyrillic) روس کی وجہ سے مستعمل ہے۔

ٹووا زبان کو خطرہ: آبادی میں تیزی سے کمی:

منگول عوامی جمہوریہ کی معیاری زبان کو وہاں کی زبان میں "خلق منگول" کہا جاتا ہے اور اس کا اپنا رسم الخط ہے جو بائیں ہاتھ کی طرف سے اوپر سے نیچے کی طرف لکھا جاتا ہے۔ منگولیائی صحراؤں میں ٹووا (Tuva) زبان بولنے والے خانہ بدوش بستے ہیں اور یہاں ان کی آبادی شدید خطرے سے دوچار ہے۔ ان کی آبادی اب صرف ۲۰۷ افراد پر مشتمل ہے۔ اس زبان کا تعلق ترکائی لسانی گروہ سے ہے۔ کوہِ سایان (Sayan Mountains) جو کہ مغولیہ اور روس کے درمیان سرحد پر واقع ہے اس سے پار ٹووا ٹووی [Tuvi] بولنے والے باقی لوگ بستے ہیں لیکن روس اور مغولیہ کے درمیان سخت نظامِ راہداری کی وجہ سے ان لوگوں کے روابط ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ زبان اب پڑھائی جا رہی ہے اور جمہوریہ مغلیہ کی انسانی حقوق کی تنظیمیں اس جانب متوجہ ہیں۔ اس زبان کے معدوم ہونے کی وجہ ان لوگوں کی غربت، ناموافق موسمی حالات اور سیاسی حد بندی ہیں۔

افغانستان: ملاخیل اور مغلی معدومی کی منزل میں:

ایشیا کے ایک پس ماندہ اور غریب ملک افغانستان میں جو بھی زبانیں بولی جاتی ہیں وہ تمام زندہ ہیں لیکن ان کے پنپنے کے کوئی امید افزا آثار نہیں ہیں۔

اطراف کے ملکوں کی زبانیں بھی افغانستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ یہاں کی اہم زبان پشتو ہے لیکن دَرّی فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے جسے زیادہ تر وہ لوگ بولتے ہیں جو خود نسلاً تاجک ہیں۔ اس کے علاوہ تیسری بڑی زبان ازبکی ہے اور پھر ترکمانی ہے۔ یہاں عربی کی آمیزش کے ساتھ ایک زبان بولی جاتی ہے جسے عربی تاجکی یا بلخی عربی بولتے ہیں۔ یہ افرو ایشیائی سامی النسل زبان ہے اور اس کے بولنے والے اب

تقریباً ۴ہزار کے قریب ہیں۔ یہاں دو لاکھ کے قریب براہوی زبان بولنے والے لوگ بھی ہیں جو ایک دراوڑی زبان ہے۔ درواذی زبان ترکی و فارسی زبانوں کی آمیزش کے ساتھ واخان و پامیر کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ لوگر صوبے میں ایک زبان ملاخیل اب معدومی کے قریب پہنچ چکی ہے ۱۹۸۳ء میں اس کے بولنے والے صرف دو ہزار تھے یہ ایک غیر نوعی زبان ہے۔ ایک اور زبان یہاں بولی جاتی ہے جو چنگیز خان کی افواج کی باقیات تھی اور اب تقریباً معدوم ہونے کو ہے۔ اس زبان کا نام مغلی یا موغولی ہے جو التائی خاندان کے منگولی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس زبان کے بولنے والے قندوز اور ہیرات کے گاؤں میں آباد ہیں اور ان کی آبادی تقریباً دو سو کے قریب ہے۔

آبادی کی کمی: منجی، مڑی، پہلوانی، پراچی اور پاریہ خطرے میں:

افغانستان کی منجی (Munji) زبان دو ہزار لوگ بولتے ہیں یہ پامیر کے مشرقی علاقے میں بولی جاتی ہے اور ہند ایرانی شاخ سے اس کا تعلق ہے۔

اور مڑی کے بولنے والے اب پچاس رہ گئے ہیں اس زبان کو ''برجستہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

پہلوانی زبان کے بھی کچھ لوگ رہ گئے ہیں جو صوبہ چخانسور میں بستے ہیں۔ پراچی کے ۵۰۰ لوگ رہ گئے ہیں حالاں کہ اس زبان کے نسلی لوگ ۵ ہزار کے قریب ہیں لیکن یہ لوگ پشتو اور فارسی زبانوں کو اختیار کر کے اپنی اس زبان کو تیزی سے فراموش کر رہے ہیں۔

پاریہ زبان جسے افغانہ ناس فروش اور افغانہ سیاہ روئی یا لغمانی بھی کہتے ہیں معدومی کے کنارے پر ہے۔ ترائی زبان کے صرف کچھ لوگ رہ گئے ہیں۔ ہند آریائی خاندان کے دردا شاخ کی یہ زبان معدوم ہونے کو ہے۔ آبادی میں فطری کمی کے باعث زبانوں کا خاتمہ کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن اٹھارہویں صدی سے مغربی تہذیب کے عروج کے بعد آبادی کا تیزی سے زوال شروع ہوا جس کی بنیاد مذہب خدا اور موت کے تصورات سے انکار تھا۔

بنگلہ دیش: چک زبان خطرے میں:

بنگلہ دیش میں چک زبان بولنے والے ۱۹۰۰ افراد ہیں اور یہ ایک غیر نوعی زبان ہے جب کہ دراوڑی خاندان کی کوروکھ زبان بھی یہاں بولی جاتی ہے۔ اس زبان کے بولنے والے تیزی سے کم ہو رہے ہیں آبادی کی کمی اس زبان کی موت کا اہم ترین سبب ہوگی۔ بنگلہ دیش میں آشو چن (Asho Chin) زبان برما سے ملحقہ پہاڑی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ۱۴۲۲ ہے اور اس کا تعلق چینی تبت و برمی لسانی خاندان ہے۔

کھومی چن (Khumi Chin) یہ زبان بھی بنگلہ برما سرحدی علاقوں میں بولی جاتی ہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد ۱۱۸۸ ہے۔اس زبان کا تعلق چینی تبت و برمی لسانی گروہ سے ہے۔

لوشائی (Lushai) اور ریانگ (Riang) اور شینڈو (Shendu) زبانیں بولنے والے اب صرف ایک ایک ہزار کی تعداد میں ہیں۔ان زبانوں کے بولنے والے ملک کے مشرقی سرحدی علاقے میں بستے ہیں۔ان زبانوں کا تعلق چینی تبت و برمی لسانی گروہ سے ہے۔

یہ بنگلہ دیش کی وہ زبانیں تھیں جن کے مستقبل قریب میں معدوم ہو جانے کا خطرہ ہے۔

ازبکستان: یہودو کریمیائی تا تار ختم ہو رہی ہے:

یونیسکو نے قازقستان کی ۶ زبانوں کی فہرست دی ہے یہ تمام زندہ ہیں۔ان میں سے زیادہ تر زبانوں کا تعلق ترکائی لسانی گروہ سے ہے لیکن روسی اور یوکرینی زبانیں دیگر لسانی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اور یہاں کثیر تعداد میں لوگ انھیں بولتے اور سمجھتے ہیں۔ازبکستان میں ۷ زبانیں ہیں اور سب زندہ ہیں۔یہاں پر ترکائی لسانی خاندان کی اہم ترین زبانیں بولی جاتی ہیں۔لہجوں کے ہلکے فرق کے ساتھ کئی ترک زبانیں یہاں پھل پھول رہی ہیں اور دیگر علاقوں سے آئی ہوئی زبانوں پر اثرات ڈالنے کے ساتھ ساتھ نئی زبانوں یا بولیوں کے ظہور پذیر ہونے کا بھی سبب بنی ہیں۔یہاں عربی قواعد اور ازبک ذخیرہ الفاظ کے ساتھ ایک زبان صوبہ زرافشاں، بخارا اور سمرقند میں بولی جاتی ہے۔یہ زبان قواعد کے اعتبار سے سامی النسل ہے۔اسی طرح یہودیوں کی زبان جوازبکی تاجکی زبانوں کی آمیزش سے یہاں پر وجود میں آئی ہے جسے بخاری کہتے ہیں۔تا تاریوں کی ایک زبان جو یہاں پر بھی بولی جاتی ہے یہ لوگ جزیرہ کریمیا میں بستے ہیں اس زبان کو کریمیائی ترکش (Crimean Turkish) کہتے ہیں۔اسی طرح یہودی زبان اور ترکائی زبانوں کی آمیزش سے یہودو کریمیائی تا تار (Judeo-Crimean Tatar) زبان یہاں پر معرض وجود میں آئی لیکن ازبکستان میں اب یہ زبان معدوم ہو رہی ہے۔التائی خاندان سے اس زبان کا تعلق ہے۔

اسلام کبھی استعمار نہیں بنا:

یہ اسلام کا اعجاز ہے کہ عرب جو ساری دنیا کو عجم (گونگا) سمجھتے تھے اور فی الواقعہ اس ادعاء پر ایام جاہلیت میں انھیں تکبر کی حد تک یقین تھا، جب شمال سے مغرب اور جنوب سے مشرق تک یلغار کرتے ہوئے گئے تو انھوں نے نہ تو استعماری رویہ اختیار کیا نہ ہی نو آبادیات قائم کیں اور نہ ہی مقامی زبانوں کے رسم الخط تلوار کی نوک سے تبدیل کرنے اور قوموں کو ان کے تہذیبی اور تاریخی ورثے سے کاٹنے کی کوشش کی۔یہ بات درست ہے کہ انھوں نے لوگوں کو اسلام کے دائرے میں داخل کیا۔لیکن اس کے نتیجے میں مفتوحین فاتحین کے برابر ٹھہرائے گئے

اور لوگوں نے اسلام اسی لیے قبول کیا کہ وہ فاتحین کے شانہ بشانہ بلاتفریق کھڑے ہوسکتے تھے اور حقوق و فرائض کے اعتبار سے بھی وہ فاتحین کے برابر تسلیم کیے گئے۔ اسی لیے اسلام کی سب سے زیادہ خدمت موالی نے کی۔ اس کے برعکس انگریزوں نے ملایا اور سواحلی زبانوں کا رسم الخط تبدیل کیا، ولندیزیوں نے انڈونیشیا کی زبانوں کا قدیم اور سنسکرت رسم الخط تبدیل کر کے رومن بنا دیا۔ پرتگیزیوں نے ساحلی شہر گوا میں کونکی زبان کو، جو اردو اور ہندی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی رومن رسم الخط میں تبدیل کر دیا ہندو استعمار نے ہندوستان میں پالی زبان اور بدھ مت کا خاتمہ کر دیا اور بدھ بھکشوؤں کی ہڈیوں کو راکھ بنا کر پھونک دیا۔ روسی استعمار نے وسطی ایشیا میں تمام مسلمان نوآبادیات کے رسم الخط عربی سے سریلک (Cyrillic) میں تبدیل کر دیے لیکن عیسائی ریاستوں آرمینیا اور جارجیا کے معاملے میں روسی استعمار نے مذہبی تفریق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کا قدیم رسم الخط برقرار رکھا کیوں کہ اس رسم الخط میں عیسائیوں کا صدیوں پرانا علمی، تحقیقی اور تاریخی و ثقافتی ورثہ محفوظ تھا، لہٰذا اسے محفوظ رہنے دیا گیا۔ عہد جدید کے اس تاریخی تناظر میں ایسا ممکن ہے کہ بروشسکی زبان کو بھی ثقافتی استعماری یلغار کے نتیجے میں تاخت و تاراج کیا گیا ہو۔

اگلے سو برسوں میں ۹۰ فی صد زبانیں مٹ جائیں گی؟

ایک ایسے عہد میں جب زبانیں مٹ رہی ہیں، عالمگیریت اور سرمایہ داری کے ذریعے زبانیں مٹائی جارہی ہیں، انگریزی کو مسلط کیا جارہا ہے، نت نئی ایجادات کے باوجود جو ہر یک تنویر نشاۃ ثانیہ اور خرد افروزی کے تین سو سالوں میں استعماری طاقتوں نے کسی ایک زبان کو جنم نہیں دیا بلکہ زبانوں کو ختم کیا گیا، یہ اعزاز صرف ایشیا کو حاصل ہے کہ یہاں ایک بولی [بروشسکی] زبان بن گئی ہے اس لیے یہ سوال کہ بروشسکی زبان کتنے عرصے تک زندہ رہے گی؟ اس بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ آسٹریلیا کے ممتاز ماہر لسانیات پیٹر ہوسلر نے ایک دلچسپ و اہم پیش گوئی کی ہے کہ اگلے سو برسوں میں نوے فی صد زبانیں صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گی اور صرف پانچ یا چھ بنیادی اہم زبانیں باقی رہ جائیں گی، جن میں انگریزی، ہسپانوی، فرانسیسی، جرمن، چینی اور عربی زبانیں شامل ہیں، جب کہ ملیشیا اور انڈونیشیا میں بولی جانے والی بھاشا (Bahasa) زبان کے بارے میں امکان ہے کہ یہ زبان بھی شاید باقی رہ جائے۔ اس کا موقف ہے کہ زبانیں ہمارے اندازے سے بھی زیادہ تیزی سے فنا ہو رہی ہیں۔ مثلاً آسٹریلیا میں یورپی باشندوں سے پہلے یعنی دو سو سال قبل دو سو پچاس زبانیں بولی جاتی تھیں لیکن اب وہاں کے طول و عرض میں صرف پچاس زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کیوں کہ انگریزی استعمار نے قتل عام اور چھوٹی زبانوں کی حوصلہ شکنی کے ذریعے نسلوں کو فنا کر دیا اور زبانوں کو مٹا دیا۔

ایک اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں چھ سے دس ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں مکمل باضابطہ زبانوں کے ساتھ ساتھ بولیاں بھی شامل ہیں۔ ہوسلر کے خیال میں زبانوں کے فنا ہونے کی اصل وجہ

بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہے۔ جس کے نتیجے میں تارکین وطن اپنی زبان ترک کر کے جائے سکونت میں بولی جانے والی زبانیں اختیار کر لیتے ہیں تاکہ مقامی آبادی میں جذب ہو جائیں۔ زبان کی تبدیلی ان کے لیے اقتصادی و سماجی اعتبار سے سود مند ثابت ہوتی ہے۔

صرف چار زبانیں باقی رہ جائیں گی؟

دوسرا نقطۂ نظر نوبل انعام یافتہ ہسپانوی ادیب کامیلیو خوسے تھیلا (Camillo Jose Cela) کا ہے۔ اس نے پیش گوئی کی ہے کہ اگلی چند صدیوں تک دنیا بھر کے لوگ صرف چار زبانیں استعمال کریں گے۔ یعنی عربی، ہسپانوی، انگریزی اور چینی اس کے سوا تمام زبانیں صرف علاقائی زبانوں کا روپ دھار کر محبت اور شاعری کے لیے رہ جائیں گی۔

زبانیں کیوں ختم ہو جائیں گی؟

عالمگیریت، سرمایہ داری، آزادی اور آزادیٔ اظہار رائے کا طوفان مذاہب، تہذیبوں، ثقافتوں اور زبانوں کے لیے ایک خطرہ بن چکا ہے۔ دنیا بھر کے معاشروں میں کروڑوں سال سے موجود تنوع اور رنگا رنگی، عالمگیریت اور سرمایہ دارانہ ثقافت و تہذیب کے استعماری غلبے کے باعث اپنا وجود کھو رہے ہیں جس کے نتیجے میں زبانیں تیزی سے مر رہی ہیں اور تہذیبیں اپنی شناخت کھوتی جا رہی ہیں۔ مذہب، ثقافت اور تہذیب کے تمام ڈھانچے تیزی سے سرمایہ داری کے سانچے میں ڈھالے جا رہے ہیں یا خود بخود ڈھلنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ مغربی تہذیب کے غلبے کے باعث خاندانی نظام زبردست شکست و ریخت کا شکار ہے۔ خواہشات نفس کی ہر صورت میں تکمیل تہذیب جدید کا فلسفہ ہے اور اس فلسفے پر عمل کے باعث خاندان اور قبیلے اپنے قدیم مقامات چھوڑ کر رزق کی تلاش میں ترک وطن کر رہے ہیں۔ اعلیٰ معیار زندگی کی تلاش کے باعث خاندان دن بدن مختصر ہوتے جا رہے ہیں۔ مختصر خاندان آبادی کے خطرے سے بچنے کے لیے اُمید کی علامت سمجھے گئے لیکن اس کے نتیجے میں زبانوں کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔

کم آبادی: زبانوں کو خطرہ

یورپ اور امریکہ میں آبادی کی شرح تیزی سے کم ہونے کے باعث معیار زندگی میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے لیکن دنیا بھر میں سب سے زیادہ زبانوں کے لیے خطرات یورپ اور امریکہ میں پیدا ہوئے۔ افریقہ میں بھی زبانیں ختم ہو رہی ہیں۔ ایک ہزار چار سو زبانوں میں سے صرف آٹھ سو زبانیں باقی رہ گئی ہیں اس کی وجہ مختلف ہے۔ امریکہ کے قدیم باشندوں کی ایک ہزار زبانیں موجود تھیں لیکن اب ان زبانوں کی تعداد صرف ۱۵۰ رہ

گئی ہے۔ یورپ کی ۲۲۵ زبانوں میں سے ۵۰ زبانیں سنگین خطرات کا شکار ہیں۔ کینیڈا کی حکومت کئی سالوں سے زبانوں کے تحفظ کے لیے اپنے قومی میزانیے میں بھاری رقومات مختص کر رہی ہے جس کے نتیجے میں کئی زبانیں محفوظ ہو گئی ہیں لیکن مصنوعی حفاظت کا یہ نظام کتنے برس چل سکے گا اس سوال کا جواب بہت مشکل نہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں رومانس زبان (Romance) مسلسل خطرے میں ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں رسم الخط کی جبری اور رضاکارانہ تبدیلی کے باعث وہ قومیں اپنی تاریخ اور ماضی کے علوم و ادبیات دانش و تجربات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم کی جا رہی ہیں۔ ایسی قومیں وجود پذیر ہو رہی ہیں جن کا کوئی ماضی نہیں ہوگا نہ تاریخ یہ زندگی کا سفر سرمایہ داری کی ثقافت کے جلو میں طے کریں گی۔ حیرت یہ ہے کہ کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور ذرائع ابلاغ کی سہولیات کے باعث نئی زبانیں وجود میں آنے کے بجائے پرانی زبانیں نہایت تیزی کے ساتھ فنا کے گھاٹ اتر رہی ہیں اور اکثر طاقت کے زور پر اس گھاٹ اتاری جا رہی ہیں۔ ثقافتی استعماریت، عسکری استعماریت کے پہلو بہ پہلو دنیا بھر میں تاخت و تاراج میں مصروف ہے۔

عربی زبان کا اعجاز اور کمال:

زبانوں کی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ زبانیں عموماً ۵۰۰ سال کے بعد تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ۷۰۰ برس پہلے کی انگریزی کا متن آج کوئی انگریز نہیں پڑھ سکتا۔ مشہور انگریز شاعر چاسر (Chaucer) کی نظمیں اس کے آبائی شہر لندن میں ہر شخص سمجھنے سے قاصر ہے۔ ہندو مذہب کے علماء سنسکرت کے عالم نہیں ہوتے یہودی، عیسائی مذہب کے علما عبرانی و یونانی زبان کے عالم نہیں ہوتے، جو ان کے مذہبی صحائف کی زبانیں ہیں، اس کے برعکس مسلمانوں کے تمام علماء عربی اور فارسی زبانوں سے عموماً واقف ہوتے ہیں، یہ واقفیت قرآن و سنت کی برکت سے ابد تک قائم رہے گی۔ عربی دنیا کی واحد زبان ہے جو آج بھی پہلے کی طرح ترو تازہ ہے اور شکست و ریخت کے عمل سے محفوظ ہے۔ اس کا رسم الخط، ذخیرۂ الفاظ قواعد و ضوابط کے اصول آج بھی وہی ہیں، اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کا زندہ تعلق قرآن کریم کے ذریعے امت مسلمہ کی عبادات کا حصہ بن چکا ہے اور عبادات و مناجات کے لیے عربی زبان کا لازمی ہونا اس زبان کے فروغ اور ارتقا کا سبب ہے جس کے باعث قرآن کے متن میں کسی تبدیلی کی کوشش ہمیشہ ناکام رہے گی۔ عربی زبان دنیا کی واحد زبان ہے جس کے دو سو، ڈھائی سو الفاظ دنیا کے کسی بھی خطے میں رہنے والا ایک عام مسلمان بھی سمجھتا ہے خواہ وہ کسی نسل اور کسی زبان سے تعلق رکھتا ہو۔ پیغام رسالت مآبؐ کی طرح عربی زبان بھی زباں و مکاں سے ماورا ہو گئی ہے۔

دنیا کا ہر مسلمان عربی اصطلاحات الفاظ اور عبارتوں سے واقف بلکہ ان کا حافظ بھی ہے لہٰذا اذان، سلام، مسنون، وضو، سورہ فاتحہ، تکبیر، الحمد اللہ، استغفر اللہ، ماشاءاللہ، چند بنیادی سورتیں، ایمان و عقائد سے متعلق

چند ضروری باتیں، دعائیں، مناجات اور معاشرت کے بعض اہم مسائل سے متعلق عربی اصطلاحات مثلاً نکاح، طلاق، میراث، عدت وغیرہ وغیرہ۔ ہر مسلمان کے لیے عام باتیں ہیں۔ اس کے برعکس انجیل اور تورات جن کی اصل زبان ان مذاہب کے علماء کے مطابق عبرانی تھی مگر اب عام یہودی و عیسائی تو درکنار ان مذاہب کے علماء و فضلا بھی خال خال ہی اس کو جانتے ہیں۔

سنسکرت، قسطالوی، کورنش خطرے میں

یہی حال ہندومت کی زبان سنسکرت کا ہے عبرانی اور سنسکرت کو چند عشروں قبل اسرائیل اور ہندوستان میں زندہ کرنے کی بھرپور کوششیں شروع کی گئیں جس کے نتیجے میں ان زبانوں کے علماء کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور عبرانی اور سنسکرت پر ایک مرتبہ پھر توجہ مبذول ہوگئی ہے۔ بھارت میں "سنسکرت گرام" کے چھوٹے چھوٹے قصبے بنائے گئے جہاں سنسکرت کو رائج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ قصبے جنوبی بھارت میں بنائے گئے کیوں کہ جنوبی بھارت میں دراوڑ قوم بستی ہے اور وہاں خاندانی نظام بہت مضبوط ہے اور زبانیں خاندانی نظام میں تیزی سے پنپتی ہیں اور زندہ رہتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں زبانوں کے ختم ہونے کا ایک اہم ترین سبب قدیم نسلوں کا بے دریغ قتل عام، خواہشات نفس کا غلبہ، خاندانی نظام کا انہدام اور خاندانی منصوبہ بندی کا فروغ ہے۔ خاندان اور خاندانی نظام سے دوری نے آج دنیا کی اہم ترین زبان ہسپانوی کے ادبی لہجے "قسطالوی" (Castillian) کو معدومی کے کنارے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ہسپانیہ میں "ایک ماں ایک بچے" کا مغربی فلسفہ مقبولیت اختیار کر چکا ہے۔ جس کے باعث خطرہ ہے کہ سن دو ہزار پچاس تک ہسپانیہ کا یہ معیاری اور معلّٰی لہجہ ختم ہو جائے گا۔ انگلستان کے جزیرہ (Isle of Man) کی زبان Manx کا خاتمہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے جب کہ کورنش (Cornish) کے بولنے والے برائے نام رہ گئے ہیں۔ ثقافتی، فکری اور لسانی استعماریت کی عالمگیر جنگ جو نوآبادی نظام کے قیام کے ساتھ ہی المانوی، فرانسیسی، ولندیزی اور برطانوی استعمار نے شروع کی تھی اب برگ و بار لا رہی ہے۔ زبانوں اور ثقافتوں کی موت کا اعلان کر رہی ہے۔ ایک زبان کی موت ایک عظیم تاریخی ورثے کی موت ہے لیکن اس موت پر رونے والا کوئی نہیں ہے، کسی کی آنکھ میں کوئی آنسو نہیں ہے۔

تین ہزار زبانیں: خطرے میں

دنیا میں اس وقت کل بولی جانے والی پانچ ہزار سے زائد زبانوں میں سے ۳ ہزار زبانیں تیزی کے ساتھ زوال کا شکار ہیں زبانوں کے تحفظ کے اعتبار سے برعظیم پاک و ہند دنیا بھر میں سرفہرست ہے۔ آریاؤں کی یلغار کے بعد برعظیم کی قدیم ترین نسل دراوڑی تتر بتر کردیے گئے لیکن اپنی تہذیب، ثقافت اور زبان کی حفاظت کے لیے دراوڑیوں کے منتشر قافلے دور دراز خطوں اور فلک بوس پہاڑوں کے دامن میں آباد ہوگئے۔ سنسکرت کو

دراوڑیوں کا رسم الخط ”گرنتھا“ اختیار کرنا پڑا اور دراوڑی سلسلوں کی زبانیں تیلگو، تامل، کنٹر، ملیالم اور براہوی زبانوں کی شکل میں آج بھی محفوظ ہیں اس کی بنیادی وجہ دراوڑیوں کا مضبوط قبائلی اور خاندانی نظام تھا جس نے ان کی اجتماعیت کو شدید ترین حملوں کے باوجود زندہ رکھا اور خاندان کے مضبوط ادارے نے ان کی زبان کو کتبات، کتابوں، مخطوطات، نوشتوں اور مہروں کے بغیر نسل در نسل تک خالہ پھوپھی، چچی، نانی، دادی کے رشتوں کے ذریعے بہ حفاظت دوسری نسلوں تک منتقل کیا۔

زبانوں کی حفاظت: طریقے

بچپن کی لوریاں، سونے سے پہلے سنائی جانے والی خوبصورت کہانیاں، درد و فراق اور ہجر کے گیت ، زندگی میں رنگ گھولنے کے لیے خوبصورت داستانیں اور لوک کہانیاں دراوڑیوں کی زبان کو آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ تاملوں (دراوڑیوں) کے مضبوط خاندانی نظام، اجتماعیت اور روایات سے گہرے تعلق نے ان کی ثقافت و زبان سے محبت کو برقرار رکھا جس کی وجہ سے آج تامل زبان ملیشیا، سنگاپور اور سری لنکا کی قومی زبانوں کا درجہ رکھتی ہے۔ مغرب میں خاندان کا ادارہ ختم ہوا تو دادی نانی تو کجا اب تو ماں باپ بھی قصۂ پارینہ بن چکے لہٰذا زبانوں کا خاتمہ ایک فطری عمل ہے جو تہذیب مغرب کو اختیار کرنے کے نتیجے میں لازماً وقوع پذیر ہوکر رہے گا۔

مغرب کا غلبہ: نئی زبان سے محروم

ہماری معلومات کے مطابق سترہویں صدی میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے بعد علوم و فنون اور ابلاغی انقلاب کی عالمگیریت اور سائنس کی زبردست ترقی کے باوجود دنیا میں کسی نئی زبان کا اضافہ نہیں ہو سکا اور قدیم بولیاں تک رسم الخط اختیار کرکے زبان نہیں بن سکیں حالانکہ ذرائع ابلاغیات اور کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد زبانوں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے تھا۔ نئی زبانوں کی اہمیت کو مغرب میں محسوس کیا گیا لیکن تخلیق کے فطری اداروں کو چھوڑ کر مصنوعی طریقے اختیار کرکے مصنوعی زبان تیار کی گئیں۔ اسپرانتو، اوکسی ڈینتال، انٹرلنگوا، وولا پوک وغیرہ اس کی مثالیں ہیں لیکن ان کا انجام ”ڈولی“ (مصنوعی بھیڑ) اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی طرح اپنے انجام کو پہنچا۔

اس سلسلے میں واحد استثناء بروشسکی زبان کا ہے جو صدیوں تک بولی جاتی رہی لیکن اردو عربی رسم الخط اختیار کرنے کے بعد اب مکمل زبان کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ یہ زبان رومن اور عربی رسم الخط میں لکھی جا رہی ہے۔ لیکن اس زبان کا تعلق بھی برعظیم پاک و ہند سے ہے اور اس زبان کے فروغ میں اسمٰعیلی برادری کا خصوصی حصہ ہے کیوں کہ بروشسکی بولنے والوں کی اکثریت مذہب اسمٰعیلی کی پیروکار ہے۔ جامعہ کراچی میں پروفیسر سحر انصاری نے ایک علمی نشست میں بروشسکی زبان پر گفتگو کے بعد پروفیسر اسحاق منصوری کے ایک سوال کے جواب میں اس خدشے سے اتفاق کیا تھا کہ بروشسکی کا فروغ ایک اہم معاملہ ہے اور غالباً اسمٰعیلی ریاست کے

قیام کے لیے اس زبان پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔

برعظیم کی زبانوں میں ایک نئی زبان کا اضافہ اس دعوے کا ثبوت ہے کہ ایشیا مذاہب، تہذیب اور زبانوں کا آج بھی گہوارہ ہے۔

زبانوں کا خاتمہ: مغربی تہذیب و فلسفہ

زبانیں کیوں ختم ہو جائیں گی یا اگر بچ بھی گئیں تو صرف عشق و محبت کے لیے کیوں مخصوص ہو جائیں گی۔ اور صرف چار اہم زبانیں ابلاغ کا ذریعہ کیوں بن جائیں گی؟ ماہر لسانیات کی جانب سے اٹھائے گئے یہ سوالات اہم سوالات ہیں اور ان کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں مغربی فکر و فلسفے کی تین سو سالہ تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ غالباً اس مطالعے اور مشاہدے کے بعد مشہور انگریز نومسلم مارما ڈیوک پکتھال نے اپنے خطبات Islamic Culture میں مغربی تہذیب کو تہذیب تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ مغرب کو Society of Dogs and Pigs قرار دیتے ہیں۔ اسے وحشت و بربریت کی علامت سمجھتے ہیں اور اسے سولائزیشن تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اس فلسفہ کے نتیجے میں دنیا بھر میں Streak of Accentricity کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ مشہور فرانسیسی فلسفی Gills Deleuze مغربی تہذیب کو عالمگیر تہذیب تسلیم نہیں کرتا وہ اسے بہیمیت، وحشت و بربریت Savage قرار دیتا ہے، اپنی بعض کتابوں کے سرورق پر وہ لکھتا ہے کہ Capitalism is a Schizophrenic System واضح رہے کہ مشہور فلسفی فوکو Deleuze کے بارے میں کہتا ہے کہ 21st Century will be the Deleuze's century. یہ وہی فوکو ہے جس نے کہا تھا کہ انسان تو اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوا ہے۔ مغرب کے خلاف ان خطیبانہ بیانات کے باوجود اس کی اصل حقیقت کو سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم مغربی فکر و فلسفے کی اصلیت، حقیقت، ماہیت حیثیت اور عصری تاریخ میں اس کے مقام سے واقف نہ ہوں۔ مغرب کو سمجھنے کے لیے ہمیں انسان پرستی (Humanism)، عقلیت [Rationalism]، نشاۃ ثانیہ [Renaissance]، تحریک تنویر [Enlightenment Movement] انفرادیت اور انفرادی آزادی [Individualism and INdividual Freedom]، لبرل ازم، آزادی اظہار رائے، مساوات، رواداری، سرمایہ داری کی اصطلاحات کو تراجم کے بجائے ان اصطلاحات کا مطلب مغرب کی علمیات جنیالوجی، اور مابعد الطبیعیات اور تاریخ کے گہرے ناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہر اصطلاح ایک خاص تہذیب، تاریخ اور تمدن سے طلوع ہوتی ہے۔ اس پس منظر کو سمجھے بغیر اس اصطلاح کا صحیح مفہوم سمجھنا محال ہے۔

اصلاحات: ترجمہ ممکن ہی نہیں:

ہر اصطلاح اپنا خاص تاریخی، علمی، تہذیبی، مذہبی، نفسیاتی اور مابعد الطبیعیاتی پس منظر رکھتی ہے۔ اصطلاح کا ترجمہ کرتے ہوئے اگر ان عناصر کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کا ترجمہ غلط اور گمراہ کن ہوتا ہے لہٰذا مغربی فلسفے و سیاسیات کی اصطلاحات کے گمراہ کن ترجمے عام ہو گئے ہیں۔

"عدت" ایک اسلامی اصطلاح ہے اس اصطلاح کا سادہ ترجمہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اس ایک لفظ کے باطن میں اقدار و روایات کی ایک دنیا آباد ہے۔ "عدت" کی اصطلاح کو سمجھنے اور اس کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے مترجم کو عفت، عصمت، آبرو، حیاء، وفا، شرم، بکارت، خاندان، حسب نسب، نسل، نجابت، وراثت، حلال و حرام، نکاح و طلاق سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر اور روایات کا جاننا اور قرآن و سنت سے واقفیت ضروری ہے۔ ایک مسلمان اس روایتی معاشرے میں رہتا ہے جہاں یہ تمام اقدار زندہ و پائندہ اور بیدار ہیں۔ لہٰذا ایک دیہاتی، بدو، ان پڑھ، اجہل شخص بھی "عدت" کی اصطلاح کو سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتا لیکن اس اصطلاح کا اگر انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جائے تو صرف ایک لفظ اس اصطلاح کی وسعت اور جامعیت کو بیان کرنے سے قاصر رہے گا۔

اس تناظر میں مغربی اصطلاحات کے ترجموں کا تنقیدی جائزہ لیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ عالم اسلام میں مغربی اصطلاحات کے جو تراجم ہوئے ہیں وہ غلط سلط ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک خاص علمیاتی کونیاتی مابعد الطبیعیاتی اور تاریخی ماحول میں تخلیق ہونے والی اصطلاح کا ترجمہ ممکن ہی نہیں ہے۔ مثلاً اجماع، جمہور، عصمت صحابہ، عصمت انبیاء، ایلاء، تخییر، سعی وغیرہ ایسی اصطلاحات ہیں جن کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ممکن ہی نہیں اور اگر کر لیا جائے تو وہ اصلاً ترجمہ نہیں تشریحی ترجمہ ہوگا بالکل اسی طرح مغربی اصطلاحات Freedom، Freedom of Expression، Liberty، Liberalism، Progress، Development، Market وغیرہ کا ترجمہ ممکن ہی نہیں مثلاً مارکیٹ کی اصطلاح سترہویں صدی میں سرمایہ داری کے فروغ کے بعد رفتہ رفتہ ظہور پذیر ہوئی۔ سترہویں صدی سے پہلے دنیا کی پوری تاریخ میں بازار ضروری تھا لیکن مارکیٹ نہ تھی کیونکہ مارکیٹ کی اصطلاح کا سرمایہ دارانہ نظام سے خاص تعلق ہے۔ سترہویں صدی سے پہلے دنیا کی پوری تاریخ بازار سے واقف تھی۔ مارکیٹ سے واقف نہ تھی۔ کیونکہ مارکیٹ کی اصطلاح سترہویں صدی میں آزادی، سرمایہ داری، مذہب سے انکار اور خواہشات نفس کو الٰہ بنانے پر اصرار کے بطن سے طلوع ہوئی۔ لہٰذا مارکیٹ کا ترجمہ بازار کرنے والے مغربی تہذیب و فلسفے اور سرمایہ داری کی تاریخ سے کاملاً ناواقف ہیں۔ یہی ناواقفیت بے شمار خطرات اور حادثات کا سبب ہے۔ مثلاً Freedom کا ترجمہ آزادی کیا گیا ہے جو سراسر غلط

ہے، کچھ لوگ اس کا لفظی ترجمہ مادر پدر آزادی کرتے ہیں لیکن یہ ترجمہ بھی اس اصطلاح کی جامعیت کا احاطہ نہیں کرتا کیوں کہ آزادی کا دائرہ بہت وسیع و عریض ہے حتیٰ کہ خالق ارض و سماء اور آسمانی کتابیں بھی اس آزادی کے باعث مردہ اور بے کار قرار دی جاتی ہیں۔

Tolerance کا ترجمہ رواداری بالکل غلط ترجمہ ہے، اس اصطلاح کو سمجھنے کے لیے مغرب میں سول سوسائٹی، لوگوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت، پرائیویٹ و پبلک لائف کا فرق، حق اور خیر کا مغربی تصور، حقیقت اور علم کی مغربی تعریف، مغرب کا موت کا تصور سمجھنا ضروری ہے۔ اسے سمجھے بغیر اس اصطلاح کو سمجھنا محال ہے اور اس کا ترجمہ تو ممکن ہی نہیں۔ رواداری وہ نہیں جو اردو لفظ کے مفاہیم سے وابستہ ہے۔ مغرب میں رواداری کی بنیاد اس فلسفے پر ہے کہ کوئی چیز خیر ہے نہ حق ہے، ہر چیز حق ہے اور ہر چیز خیر۔ اس کا انحصار ہر فرد کی رائے پر ہے۔ لہٰذا آفاقی صداقتوں، الہامی کتابوں اور مجذوب کی بڑ میں کوئی فرق نہیں۔ یہ سب مساوی ہیں لہٰذا کسی فکر، کسی نظریے، کسی مذہب اور کسی خیال کو کسی دوسرے پر برتری حاصل نہیں لہٰذا اگر کسی مقام پر ایک شخص شراب پی رہا ہے، دوسرا زنا کاری میں ملوث ہے اور تیسرا نماز پڑھ رہا ہے تو تینوں اپنے اپنے تصور خیر و حق پر عمل پیرا ہیں اور چونکہ کسی تصور کو کسی دوسرے تصور خیر پر فوقیت نہیں لہٰذا رواداری کا تقاضہ یہ ہے کہ تینوں ایک دوسرے کو برداشت کریں ایسا رویہ اختیار کرنے والا فرد مہذب سولائزڈ کہلانے کا مستحق ہے اور اگر کوئی شخص دوسرے کے اعمال کو نفرت، غصے اور ناگواری کی نظر سے دیکھتا ہے اسے شر اور بدی قرار دیتا ہے تو یہ شخص غیر روادار Non-Tolerant ہے یا ابھی مہذب نہیں ہوا ہے اس میں یہ ظرف پیدا نہیں ہوا کہ دوسرے کے تصور خیر اور دوسرے کی آزادی کو اپنے تصور خیر اور تصور آزادی کے مساوی سمجھے ایسا شخص بنیاد پرست، مہذب معاشرے کے لیے سنگین خطرہ اور عالمی رواداری کے لیے دہشت گرد ہے اور ایسے شخص کو زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ Citizen اور Soverigne کا ترجمہ بھی اردو میں ممکن نہیں ان الفاظ کی خاص تاریخ ہے، اس تاریخ سے الگ کرکے کسی لفظ یا اصطلاح کا ترجمہ و تشریح ناممکن کام ہے۔

مغرب کے فکر و فلسفے کو سمجھنے کے لیے عیسائیت کے زوال اور عقلیت کے عروج کی تاریخ کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری کے فروغ کی تاریخ کو اس کے خاص تناظر کے ساتھ دیکھنا ہوگا۔ ہمیں سرمایہ دارانہ شخصیت، سرمایہ دارانہ معاشرے اور سرمایہ دارانہ ریاست کے گہرے تعلق کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔ سرمایہ دارانہ ریاست کے تین بنیادی کام ہیں حرص و حسد کی عالمگیریت، ابدیت دنیا اور تصور موت کا انکار اور اس سے فرار اس ریاست اور نظم معاشرت کو قائم کرنے کے لیے سرمایہ داری فورڈازم اور پوسٹ فورڈازم کے ادوار سے گزر چکی ہے۔ فطری اجتماعیتوں کے خاتمے کے بعد مصنوعی اجتماعیتوں کا ظہور ایک تاریخی عمل ہے جس سے واقفیت لازمی ہے، انسانی

حقوق کے فلسفے کا گہرا جائزہ بھی ضروری ہے، اس سلسلے میں ہمیں مغربی فکر میں مذہب، فلسفہ اور سائنس کے فکری مباحث اور ان کے باہمی تعلق کی نوعیت پر غور کرنا ہوگا اور مغرب کے تصور نفس Self کو سمجھنا ہوگا، مغربی فکر میں مذہب کا، خدا کا، انسان کا، آخرت کا، موت کا کیا مقام ہے اسے سمجھے بغیر ہم پیش قدمی نہیں کر سکتے ۔

مغرب :فکر و فلسفہ تہذیب

مغرب میں حق کی جگہ خواہش نفس، خیر کی جگہ مفاد عامہ، کتاب بائبل کی جگہ کتاب فطرت اور کتاب آئین [Constitution]، خدا کی جگہ عقل، نیچر، فلسفہ، سائنس اور ٹیکنالوجی، پیغمبر کی جگہ سوشل سائنٹسٹ سائنس دان اور فلسفی، مذہب کی جگہ مذہب سرمایہ داری، حقوق اللہ کی جگہ بنیادی حقوق، حقوق العباد کی جگہ انسانی حقوق، خالق کی جگہ مخلوق، معبود کی جگہ عبد، عقیدہ کی جگہ تجربہ اور ایمان کی جگہ سائنٹفک میتھڈ Scienctific Method نے لے لی ہے۔ کائنات کے بارے میں انسان کا نقطہ نظر تبدیل ہوگیا ہے۔ پہلے خدا کائنات میں مرکزی مقام رکھتا تھا اب اس کی جگہ انسان کو بٹھا دیا گیا ہے۔ اب مخلوق ہی خدا ہے یہی انسانیت ہے۔ مغرب نے حقیقت، علم، تصور حق، تصور خیر کے کروڑوں سالہ پرانے نظریات کو بدل ڈالا ہے۔ مغرب کا بنیادی ذریعہ علم عقل اور وجدان ہے جس سے حقیقت تک رسائی ہو سکتی ہے۔ فکر مغرب کو سمجھنے کے لیے کانٹ، ہیگل، نطشے، برگساں کر کے گارڈ، مارکس، فرائیڈ ہائیڈ یگر، Witengenstein، ہیبر ماس سارتر، فوکالٹ، دریدا کا مطالعہ ضروری ہے۔ مغربی فکر و فلسفے کے نتیجے میں ایک ایسا معاشرہ قائم ہوا جو مذہبی معاشرے کی ضد تھا اور اپنے آپ کو لبرل کہتا تھا جس کے باعث دنیا میں خوں ریز جنگیں ہوئیں اور انسانیت خطرے میں پڑ گئی۔ کروڑوں لوگوں ہلاک کیے گئے، ہلاک کرنے والے وہ لوگ تھے جو سولائزڈ، روادار Tolerant، روشن خیال Enlightened غیر مذہبی بلکہ مذہب کے دشمن اور انسانیت کے پجاری تھے۔

سرمایہ دارانہ معاشرے نے کیا اقدار دیں:

حرص و حسد اور غرض کی بنیاد پر اٹھارہویں صدی میں قائم شدہ مغربی معاشرہ جو عیسائیت کے مقابلے پر قائم کیا گیا شروع میں صرف چند شہروں تک محدود تھا نیپلز میں، فلارنس میں اور اٹلی کے کچھ شہروں میں۔ سوئٹزر لینڈ میں کہیں کہیں بحیثیت مجموعی جو یورپین معاشرہ تھا وہ عیسائیت کے زیر اثر تھا۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ (سول سوسائٹی) بہت دھیرے دھیرے پھیلا۔ اس کے نتیجے میں بڑے بڑے شہر بنے اور پھر اس کے بعد ملک بنے اور پھر اس کے بعد یورپ میں بحیثیت مجموعی اور پھر اس کے بعد یورپ کی نوآبادیات میں یہ معاشرہ پھیل گیا تو اس کے نتیجے میں کون سے اخلاق نے فروغ پایا۔ کس قسم کے اقدار، افکار، طرز زندگی، طرز معاشرت کو فروغ ہوا۔ کوئی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ جس اخلاق نے فروغ پایا وہ حرص و حسد اور شہوت و غضب کے جذبات تھے کوئی اس کا

انکار نہیں کرسکتا ہے کہ عملاً جن اقدار نے فروغ پایا اس تبدیلی کے بعد وہ اقدار رذیلہ تھے، اور وہ حرص و حسد اور طمع اور شہوت و غضب اور فرعونیت اور خودغرضی ہی تھے اور کچھ اور نہیں تھے یہی یورپ کی تاریخ ہے لہٰذا دنیا میں جہاں جہاں بھی سول سوسائٹی قائم ہوئی وہاں اخلاق رذیلہ کو فروغ حاصل ہوا۔ محبت ختم ہوئی، نفرت عام ہوئی اور انسانیت کے نام پر تاریخ کے سب سے بڑے قتل عام ہوئے۔ مائیکل مین کے مطابق جمہوری معاشروں نے چھ کروڑ لوگوں کا قتل کیا اور محتاط اعداد و شمار کے مطابق مغربی تہذیب کے ہاتھوں بارہ کروڑ افراد تین سو سال میں قتل ہو چکے ہیں۔ جب نفس الٰہ ہوگا، شہوت حرص و حسد معاشرے کی اصل طاقتیں ہوں گی، زنا عام ہوگا، خاندان ختم ہوں گے، آبادی کم ہوگی، زبانیں مٹ جائیں گی، ورنہ طاقت سے مٹا دی جائیں گی۔ جب معاشرے میں اخلاقیات ختم ہوجائے وہاں رشتے بھی ختم ہوجاتے ہیں نتیجتاً خاندان باقی نہیں رہتا، احترام ختم ہوتا ہے اور پھر نسل اور زبان ختم ہوجاتی ہے۔ تہذیب مغرب کے زوال کا نسلوں اور زبانوں کے زوال سے گہرا تعلق ہے اس تعلق کی تفصیل درج ذیل ہے:

مغرب: آبادی کا زوال زبانوں کا خاتمہ:

دنیا بھر میں مغربی فکر و فلسفے کی بنیادوں پر قائم جدیدیت پسند ممالک کی شرح آبادی تیزی سے کم ہورہی ہے اور بہت سے ممالک میں شرح آبادی صفر ہوگئی ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ سترہویں صدی تک یورپ کی آبادی کبھی پندرہ کروڑ سے تجاوز نہ کرسکی لیکن لوتھر کی تحریک اصلاح کے فروغ اور سرمایہ داری کے غلبے کے بعد جدید قومی ریاستوں کے قیام نے آبادی کی اہمیت کا اندازہ لگایا اور ایک سو برس میں یورپ کی آبادی دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۴۵ کروڑ تک پہنچ گئی مگر سرمایہ دارانہ نظام حرص و حسد کی ایک ایسی فضا تعمیر کرتا ہے جس میں قومیت تحلیل ہوجاتی ہے اور قوم پرستی کا بھوت قربانی کے دام سے نکل کر تعیشات کے طلسمی پنجرے میں قید ہوجاتا ہے جس کے نتیجے میں مغرب کو تیزی سے آبادی کے زوال کا سامنا ہے۔ یہ زوال کہاں رکے گا کچھ کہنا مشکل ہے۔ جدیدیت پسند ممالک سے مراد وہ ممالک ہیں جو مذہب کے بجائے "مذہب جدیدیت" آزادی، روشن خیالی، خرد افروزی، انفرادیت پسندی، وسیع النظری، مذہب سے نفرت اور مذہب بےزار رویے، حرص و حسد، سرمایہ داری، جمہوریت، شہوانیت اور نفس کی پرستش میں مبتلا ہیں ایسے تمام ممالک میں اخلاقی قدریں ختم ہوجاتی ہیں اور جنسی آوارگی و لذت پسندی کے فلسفے کے باعث شادی کا ادارہ ختم ہوجاتا ہے، مستقل ازدواجی تعلقات، آزادانہ شہوت زانی کے باعث ختم ہوجاتے ہیں۔ طلاق کے سخت قوانین کے باعث مرد شادیاں نہیں کرتے، اعلیٰ معیار زندگی کے باعث بچوں کی پرورش کے لیے روپیہ نہیں ہوتا اور مرد و عورت دونوں معیار زندگی کے لیے نوکری کرتے ہیں تو بچوں کی پرورش کے لیے وقت بھی نہیں ہوتا۔ یہ اس مغرب کا حال ہے جو سب سے زیادہ خوش حال ہے۔ آبادیاں کم

ہوتی ہیں تو زبانیں بھی مٹنے لگتی ہیں۔

چودہ ہزار ڈالر لیجیے: بچے پیدا کیجیے

مغرب میں خوشحالی کی یہ عجیب کیفیت ہے کہ مرد و عورت کے پاس نہ دولت ہے نہ وقت، اس لیے وہ بچے پیدا نہیں کرتے، یہ محض دعویٰ نہیں ہے اس کا تازہ ترین ثبوت اٹلی کی حکومت کا تازہ فیصلہ ہے۔ امریکی اخبار لاس اینجلس ٹائمز کے مطابق اٹلی میں مقامی آبادی تیزی سے کم ہو رہی ہے، دو ہزار پچاس تک یہ آبادی ایک تہائی رہ جائے گی۔ اخبار کے مطابق زیادہ تر جوڑے اس وجہ سے بچہ پیدا کرنے میں دلچسپی نہیں لیتے کہ ان کے پاس اسے پالنے کے لیے نہ پیسہ ہوتا ہے نہ وقت لہٰذا اٹلی کی حکومت نے بچہ پیدا کرنے والے جوڑے کو چودہ ہزار امریکی ڈالر ادا کرنے کی اسکیم شروع کی ہے۔ [جنگ ڈان دس فروری ۲۰۰۵ء]

روم میں لاکھوں بلیاں مزے کر رہی ہیں:

اٹلی میں مغربی تہذیب نے عجیب ستم ڈھایا ہے کہ ماں باپ اولاد سے محروم ہیں کیونکہ دونوں کے پاس نہ وقت ہے نہ دولت لہٰذا ماؤں کی ممتا نے محبت کے عجیب و غریب طریقے اختیار کیے ہیں۔ روم کے گلی کوچوں میں عورتیں اپنی ممتا کی پیاس لاکھوں بلیوں کو دودھ پلا کر بجھاتی ہیں۔ ریاستی ذرائع و وسائل بلیوں کے لیے وقف ہیں۔ امیر عورتیں اپنے بچوں کو پیدا ہونے سے روکتی ہیں کہ انھیں دودھ نہ پلانا پڑے لیکن جانوروں کی خدمت میں کوشاں ہیں اس کی تفصیلات ہوش ربا ہے۔ گارجین سروس کے Sopie Arie کے مطابق:

If you get up early in Rome you see thing you are not suppose to see: a gladiator spooning down a pot of yogurt before starting a long day.

There is an un feasible number of cats at large in eternal city. And they are tended to by long established army of cat feeders mainly women.

Early in the morning the "gattare" cat-ladies can be seen on street corners, among the ruins of grave stones, tenderly dishing up plates of chopped spaghetti with turkey bits or emptying cat food on to china plates.

The cat ladies are part of the city. They range from the elegant diplomat's wife type to housewives animal-loving expats, sentimental teen-agers and lonely bag ladies.

Judging by plums, glossy appearance of average Roman stray cat (of which there are thought to be 200,000) there is no shortage of

catladies.

These days they are providing far more than food. No Roman moggy would miss the defleaing, jabbing and mollycoddling on offer.

At Torre Argentina, the terminus of the number 8 tram, near the spot where Julius Caesar was stabbed by Brutus, hordes of stray cats lounge around among the remains of an ancient temple.

Here the cat ladies have become so organized they run a cat adoption website with mugshots of the cats on offer.

Across the city, in the shadow of the Pyramid of Caius Costius, is the Protestant cemetery, where Keats and Shelley are buried. Here more cats gather, tails up, to meet Matilde Talli who turns up every morning at 7:30 to look after her feline friends.

Thanks to donations from the Anglo-Italian Society for the Protection of Animals, the cats who live at the pyramid even have a shed full of lined baskets to ensure they sleep well. In the winter, steam rises from the shed's catflaps as all 80 huddle inside.

Cats are almost as sacred here as cows are in India.

The law of Lazio, the region around Rome, gives stray cats the right to stay wherever they are born.

Stray cats are protected as "biocultural heritage" and Romans are obliged to make sure they are fed and given medical assistance. Cats cannot be putdown unless they have incurable diseases or are in pain but they can be neutered or spayed. The local government provides the service for free, and regular checkups thereafter. [The Gaurdian News Service 13, November 2004]

مارماڈیوک پکتھال نے اپنے خطبات ''اسلامک کلچر'' میں مغربی تہذیب کے بارے میں یہی بات کہی تھی اور گارجین کی خبر اس بیان کی توثیق ہے۔ یہ انسانیت ہے کہ بچے پیدا نہ کیے جائیں۔ جانوروں سے محبت کی جائے۔ افریقہ اور ایشیا میں کروڑوں بچے بھوک سے مر رہے ہیں اور روم میں لاکھوں بلیوں کو بہترین کھانا، دودھ عمدہ رہائش گاہیں، علاج معالجے کی سہولتیں حاصل ہیں اسی لیے محقق اس تہذیب کو وحشت، بربریت اور بہیمیت کہتے ہیں تو غلط نہیں کہتے۔

چین :بیویاں نہیں مل رہیں:

چین جومغربی تہذیب کا خوشہ چیں ہےاس کا حال بھی بہت ابتر ہے۔ایک خاندان ایک بچہ کی حکمت عملی جو۱۹۸۴ء میں وضع کی گئی اس کا منفی نتیجہ یہ نکلا کہ چین میں لڑکیوں کی آبادی خطرناک حد تک کم ہوگئی ہےاور چینی مردوں کی تعداد میں اضافے کے باعث انھیں شادی کے لیے چینی لڑکیاں دستیاب نہیں،امیر چینی ہانگ کانگ،فلپائن اور دوسرے ممالک کی لڑکیوں سے شادی کرلیتے ہیں،چینی مردوں کے مقابلے میں کم چینی لڑکیوں کے باعث چینی لڑکیوں کے مطالبات بھی بہت بڑھ گئے ہیں،ذرائع ابلاغ پر ڈرامے اور پروگرام دیکھ کر وہ بھی اعلیٰ معیارزندگی کا خواب دیکھ رہی ہیں لہٰذا وہ آراستہ پیراستہ خوبصورت اور جدید سہولیات سے مزین کمرہ کی طلب گار ہوتی ہیں۔اس بوجھ کا اٹھانا غریب چینی مردوں کے لیے محال اور متوسط طبقات کے لیے ناممکن ہوگیا ہے لہٰذا خاندان کا ادارہ خطرے میں پڑ گیا ہے۔

چین :دوسرا بچہ ضروری مگر جرمانہ دیجیے:

چین کے وزیر داخلہ نے اس صورت حال کا اعتراف کرتے ہوئے ایک بچے کی حکمت عملی کو ناکام قرار دیا ہے۔بعض چینی صوبوں میں ماں باپ کو جرمانے کی ادائیگی کے بعد دوسرے بچے کی پیدائش کی اجازت دی گئی ہے، یہ اجازت بھی سودمند نہ ہوگی کیونکہ ماں باپ چاہیں گے کہ دوسرا بچہ بھی لڑکا ہو لہٰذا عورتوں کی تعداد کم رہے گی۔چین میں صرف ایک بچے کی پیدائش کی اجازت کے بعد ہر خاندان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ لڑکا پیدا کریں تاکہ وہ ان کے بڑھاپے کا سہارا بنے۔فطرت سے جنگ چینیوں کو بھی مہنگی پڑ رہی ہےاور مغرب میں تو فطرت سے خوفناک جنگ کے نتیجے میں آبادی کی شرح منفی ہوگئی ہے۔یہ مغربی تہذیب کے لازمی منطقی اور فطری نتائج وثمرات ہیں۔افسوس یہ ہے کہ ہم اس تہذیب سے مرعوب ہیں جو خودخودکشی کررہی ہے جس کے نتیجے میں زبانیں بھی خودکشی کے عمل سے گزر رہی ہیں۔

مغرب کی ماں:دردِ زہ سہنا نہیں چاہتی:

مغرب کی ماؤں نے لذت کے فلسفے کے تحت بچوں کی پیدائش کے عمل میں درپیش تکالیف سہنے سے انکار کردیا ہے،وہ بچے کو اپنی لذات کے درمیان حائل دیوار سمجھتے ہیں پھر وقت اور پیسے کا مسئلہ الگ ہے۔آخرت کا تصور ان کی تہذیب میں شامل نہیں ہے لہٰذا وہ بعد ازموت زندگی کے قائل نہیں لہٰذا اسی زندگی کو حاصل سمجھ کر اسے ضائع کرنا نہیں چاہتے اسی لیے وہ نہ مرنے پر تیار ہیں نہ قربانی دینے پر۔بچے کی پیدائش سے لے کر بلوغت تک کا زمانہ جاں گسل زمانہ ہوتا ہے جو ہر لحظہ قربانی کا طلب گار ہوتا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام نے انسان کو حاسد و حریص بنا

کر اس سے قربانی کا جذبہ چھین لیا ہے۔ قربانی کی عظیم ترین علامت ماں ہے اسی لیے ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ اسلام میں ماں کا درجہ باپ سے بلند ہے اور میراث میں باپ اور ماں کا حصہ برابر ہے۔ باپ پر ماں کی یہ فضیلت صرف اس کی قربانیوں کا صلہ ہے۔

فوجیوں کی تجہیز و تکفین:

چند سو سپاہیوں کی موت سے امریکا میں بھونچال پیدا ہو جاتا ہے۔ امریکی بیویاں اپنے فوجی شوہروں کو رخصت کرتے ہوئے ماتم کرتی ہیں، دنیا بھر کے برقیاتی ذرائع ابلاغیات پر پابندی ہے کہ وہ مرنے والے امریکی فوجوں کے تابوت، موت کے مناظر اور رسومات، تجہیز و تکفین نہ دکھائیں اس سے لوگوں میں خوف و ہراس پھیلتا ہے۔ مغرب کا یہ رویہ اپنی تہذیب پر عدم اعتماد کا ہے۔ مغرب کے جوان اور اس تہذیب کے خالق اپنی تہذیب سے محبت تو کرتے ہیں لیکن اس کے تحفظ کے لیے اس پر فنا ہونے، مرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کی وجہ نفس، ذات تعیشات اور دنیا کی زندگی سے بے پناہ محبت ہے۔ ایسی زندگی سے جو موت کے تصور سے خالی اور آخرت کے وجود سے انکاری ہے۔ مذہب کو اختیار کیے بغیر آبادی میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ خاندان اور مرد بیوی کے تعلق کی بنیاد محبت اور نکاح پر ہے۔ یہ بنیاد صرف مذہب فراہم کرتا ہے اور ان بنیادوں کے بغیر نہ کوئی معاشرہ زندہ رہ سکتا نہ کوئی زبان۔

معیار زندگی بلند: آبادی کم:

مذہب اور ایثار و قربانی کے بغیر اولاد کے دکھ درد برداشت کرنا ممکن نہیں۔ لبرل ازم، ہیومن ازم، ڈیمو کریسی، سوشل ڈیمو کریسی، کیپٹل ازم کے فلسفے کے تحت لذت پرستی مقصد زندگی بن جاتی ہے جو ایثار و قربانی کی ضد ہے لہٰذا مغربی معاشرے آج یا کل مذہب کو اختیار کریں گے ورنہ فنا ہو جائیں گے۔ جس طرح جاپانی نسل مائیکرو اسکوپک کمیونٹی بن گئی ہے۔ مشین اور ٹیکنالوجی روبوٹ اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی اولاد کا بدل نہیں ہو سکتی، یہ مسلمہ اصول ہے کہ معیار زندگی بلند کرنے کا لازمی نتیجہ شرح افزائش میں کمی ہے اور سادگی کا نتیجہ شرح افزائش میں اضافہ۔ شرح افزائش میں کمی کے باعث جب نسلیں پیدا نہ ہوں گی تو زبانیں کیسے زندہ رہیں گی لہٰذا جہاں جہاں مغربی تہذیب کو غلبہ حاصل ہو گا وہاں آبادی تیزی سے کم ہو گی جن ملکوں میں آبادی زیادہ ہو گی مغربی ممالک وہاں خاندانی منصوبہ بندی پر اربوں ڈالر خرچ کریں گے تا کہ وہاں کی شرح آبادی کم ہو جائے اور مغرب کے لیے آبادی کا مہلک بم خطرہ نہ بن سکے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے تمام اداروں اور تنظیموں کو اسی لیے اربوں روپے کی امداد مغربی ممالک فراہم کرتے ہیں لیکن زبانوں کی حفاظت کے لیے اتنی رقم خرچ نہیں کی جا رہی۔

ذیل میں یورپ و دیگر جدید ممالک کی شرح آبادی کے اعداد و شمار ملاحظہ کیجیے۔

یورپی ممالک کی شرح آبادی:

[۱] آرمینیا 0.64فیصد، [۲] آسٹریا 0.01فیصد، [۳] بیلا روس 0.61فیصد، [۴] بلجیم 0.05 فیصد، [۵] بلغاریہ 0.64فیصد، [۶] کروشیا 0.15فیصد، [۷] قبرص 0.53فیصد، [۸] چیک جمہوریہ 0.17 فیصد، [۹] ڈنمارک 0.59فیصد، [۱۰] ایسٹونیا 0.45فیصد، [۱۱] فن لینڈ 0.08فیصد، [۱۲] فرانس 0.29فیصد، [۱۳] جارجیا 0.31فیصد، [۱۴] جرمنی 0.14فیصد، [۱۵) یونان زیرو فیصد، [۱۶] ہنگری 0.38فیصد، [۱۷] آئس لینڈ 0.74 فیصد، [۱۸] آئرلینڈ 0.66 فیصد، [۱۹] اٹلی 0.12فیصد، [۲۰] لاتویا 0.65فیصد، [۲۱] لیختن اسٹائن 0.45فیصد، [۲۲) لگزمبرگ 0.32فیصد، [۲۳] لتھوانیا 0.27فیصد، [۲۴] مقدونیہ 0.56 فیصد، [۲۵) مالدووا 0.12فیصد، [۲۶] ہالینڈ 0.29فیصد، [۲۷] نا روے 0.26فیصد، [۲۸) جنوبی امریکہ کا ملک پناما 1.36 فیصد، [۲۹] پولینڈ 0.03 فیصد، [۳۰] پرتگال 0.13 فیصد، [۳۱] رومانیہ 0.15 فیصد، [۳۲] روس 0.42فیصد، [۳۳] سان مارینو 0.26فیصد، [۳۴] سربیا 0.19فیصد، [۳۵) سلوواکیہ 0.09 فیصد، [۳۶] سلووینیا 0.08 فیصد، [۳۷] اسپین 0.01 فیصد، [۳۸] سویڈن 0.08 فیصد، [۳۹] سوئٹزر لینڈ 0.01فیصد، [۴۰] یوکراین 0.68فیصد، [۴۱] برطانیہ 0.01فیصد، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یورپ میں آبادی بڑھنے کے بجائے تیزی سے کم ہورہی ہے ۔ اس کے برعکس مذہبی معاشروں اور مسلم دنیا میں آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کے باعث چند مسائل بھی درپیش ہیں لیکن یہ مسائل ان مسائل سے بہت کم ہیں جن کا سامنا یوروپی ممالک کو ہے۔

مسلم دنیا کی شرح آبادی

[۱] افغانستان 2.8 فیصد، [۲] البانیہ 1.21 فیصد، [۳] الجزائر 1.72 فیصد، [۴] آذربائیجان 0.92فیصد، [۵) بحرین 1.56فیصد، [۶] بنگلہ دیش 1.67فیصد، [۸] برونئی 1.67فیصد، [۹) برکینا فاسو 2.73فیصد، [۱۰) چاڈ 3.27فیصد، [۱۱] جزائر قمر 2.99فیصد، [۱۲] کوتے دی آئیور 2.33فیصد، [۱۳] جبوتی 2.57 فیصد، [۱۴] مصر 1.68 فیصد، [۱۵] آئریٹریا 3.06 فیصد، [۱۶] گیمبیا 2.86 فیصد، [۱۷] ایتھوپیا 2.63فیصد، [۱۸] گھانا 1.78فیصد، [۱۹] گنیا 2.33فیصد، [۲۰] گنیا بساؤ 2.29فیصد، [۲۱] انڈونیشیا 1.56 فیصد، [۲۲] ایران 1.22 فیصد، [۲۳] عراق 2.82 فیصد، [۲۴] اردن 2.2 فیصد، [۲۵] قازقستان 0.71 فیصد، [۲۶] کویت 1.96 فیصد، [۲۷] کرغیزستان 1.7 فیصد، [۲۸] لبنان 1.36فیصد، [۲۹] لیبیا 2.41فیصد، [۳۰] ملیشیا 1.91فیصد، [۳۱] مالدیپ 1.96فیصد، [۳۲] مالی 3 فیصد، [۳۳] ماریطانیہ 2.92فیصد، [۳۴] مراکش 1.78فیصد، [۳۵] نائجیر 2.77 فیصد، [۳۶] نائجیریا 2.51

فیصد، [۳۷] عمان 3.37 فیصد، [۳۸] پاکستان 2.16 فیصد، [۳۹] قطر 1.14 فیصد، [۴۰] سینیگال 2.88 فیصد، [۴۱] سیرالیون 2.58 فیصد [۴۲] صومالیہ 2.88 فیصد، [۴۳] سوڈان 2.74 فیصد، [۴۴] سعودی عرب 3.16 فیصد، [۴۵] شام 25 فیصد، [۴۶] تاجکستان 25 فیصد، [۴۷] تیونس 1.18 فیصد، [۴۸] ترکی 1.2 فیصد، [۴۹] ترکمانستان 1.94 فیصد، [۵۰] ازبکستان 1.81 فیصد، [۵۱] یمن 3.4 فیصد، [۵۲] متحدہ عرب امارات 1.44 فیصد۔

مذہبی معاشروں کی آبادی میں اضافہ:

مذہبی معاشروں کی آبادی بھی بڑھ رہی ہے مثلاً اسرائیل، ہسپانیہ، ہندوستان وغیرہ مگر آبادی کی شرح میں یہ اضافہ مسلم ممالک کے مقابلے میں بہت کم لیکن مغربی معاشروں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

یہ اعداد و شمار یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ مغربی ممالک کی آبادی میں اضافے پر مغرب کی تشویش کا سبب کیا ہے، مسلمانوں کی آبادی میں تیز ترین اضافہ اور اپنی آبادی میں خطرناک حد تک کمی پر اہل مغرب کی تشویش بلاوجہ نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ مغربی ممالک اپنی آبادی میں اضافہ چاہتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے اس کی بہتری کی کوششیں کرلیں اس کے باوجود خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوسکا۔ بہت سی سہولیات کے باوجود لوگ بچے پیدا کرنا نہیں چاہتے، تسخیر کائنات اور سیر و فی الارض کی راہ میں یہ بدبخت بچے بے پناہ رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف اسی کام کے لیے پیدا کیا ہے۔ مغرب کو اس پر بھی حیرت ہے کہ سابق سوویت روس میں غیر مسلم اقوام کے ہاں شرح پیدائش منفی تھی جب کہ مسلمانوں کے ہاں پیدائش کی شرح مثبت تھی۔ سابق سوویت یونین کی حکومت نے اس پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکی۔

دوسروں کی آبادی بڑھنے سے روک دو:

جب مغرب اپنی آبادی میں اضافہ نہ کرسکا تو انھوں نے دوسری ترکیب اختیار کی اور وہ ترکیب یہ تھی کہ مسلمانوں اور مذہبی معاشروں کی آبادی کو بڑھنے سے روکا جائے اس کو خاندانی منصوبہ بندی کا خوشنما نام دیا گیا۔ پاپولیشن ایکسپلوژن [آبادی کا دھماکہ] جیسے خطرے کی خبر دی گئی اور نظریہ یہ پیش کیا گیا کہ آبادی اگر اسی طرح بڑھتی رہی تو وسائل گھٹتے چلے جائیں گے اور ایک گھڑی وہ آئے گی کہ وسائل ختم ہو جائیں گے اور انسان پر بھوک اور افلاس کا سایہ چھا جائے گا مگر مذہبی لوگوں کو اس فریب میں مبتلا نہیں کرسکے، جس ملک میں آبادی زیادہ ہوگی اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں مذہب آج بھی ایک قوت ہے کیونکہ آبادی میں اضافہ نکاح اور خاندان اور قربانی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ تمام کام روایتی، مذہبی معاشروں میں ہی ممکن ہیں۔ مذہبی معاشروں نے مغرب کے فلسفے کو رد کیا تو اس کے بعد یہ جھانسہ دیا گیا کہ آبادی اگر یونہی بڑھتی رہی تو رہنے کی جگہ نہیں رہے گی، اور آج بیشتر مسلمان

اورغیر مسلم دانشوراس فریب میں مبتلا ہیں حالانکہ اگر اس کی حقیقت معلوم کی جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ بھی ایک بہت بڑا دھوکہ ہے۔ آبادی کی گنجانی کے لحاظ سے مسلم دنیا اور صرف یورپ کا تقابل اس کے لیے کافی ہوگا۔ ذیل میں مسلم دنیا اور غیر مسلم دنیا میں سے صرف یورپ کے اعداد وشمار ملاحظہ ہوں:

مسلم دنیا میں آبادی کی گنجانی: فی مربع میل

[۱]افغانستان 111افراد فی مربع میل، [۲)البانیہ 334فی مربع میل، [۳]الجزائر 35فی مربع میل، [۴]آذربائیجان 233فی مربع میل، [۵]بحرین 2746فی مربع میل، [۶]بنگلہ دیش 2580فی مربع میل، [۷]بوسنیا 201 فی مربع میل، [۸]برونئی 175، [۹]برکینا فاسو 119، [۱۰)چاڈ19، [۱۱]جزائر قمر 838، [۱۲]کوتے دی ایوار 137، [۱۳]جبوتی 56، [۱۴]مصر 184، [۱۵]اریٹیریا 95، [۱۶]ایتھوپیا 157، [۱۷]گامبیا 373، [۱۸]گھانا 228، [۱۹)گنیا 82، [۲۰]گنیا بساؤ 125، [۲۱]انڈونیشیا 329، [۲۲)ایران 105 ۲۳)عراق 143، [۲۴]اردن 150، [۲۵]قازقستان 16، [۲۶]کویت 306، [۲۷]کرغیزستان 62، [۲۸]لبنان 943، [۲۹)لیبیا 8، [۳۰]ملائیشیا 179، [۳۱]مالدیپ 2764، [۳۲]مالی 24، [۳۳]ماریطانیہ 8، [۳۴]مراکش 181، [۳۵]نائیجر 22، [۳۶]نائیجیریا 369، [۳۷]عمان 33، [۳۸]پاکستان 491، [۳۹]قطر 189، [۴۰]سینگال 143، [۴۱]سیرالیون 303، [۴۲]صومالیہ 32، [۴۳]سوڈان 40، [۴۴]سعودی عرب 28، [۴۵]شام 241، [۴۶]تاجکستان 122، [۴۷] تیونس 174، [۴۸]ترکی 226، [۴۹]ترکمانستان 25، [۵۰]ازبکستان 178، [۵۱]یمن 92، [۵۲]متحدہ عرب امارات 76

یوروپ میں آبادی کی گنجانی: فی مربع میل

[۱] آرمینیا 290، [۲] آسٹریا 256، [۳] بیلاروس 129، [۴]بلجیم 878، [۵]بلغاریہ 178، [۶] کروشیا 201، [۷)قبرص 213، [۸] چیک جمہوریہ 337، [۹] ڈنمارک 327، [۱۰]اسٹونیا 81، [۱۱]فن لینڈ 44، [۱۲]فرانس 284، [۱۳]جرمنی 616، [۱۴]جارجیا 184، [۱۵]یونان 211، [۱۶]لیختن اسٹائن 282، [۱۷] آئس لینڈ 7، [۱۸] آئرلینڈ 146، [۱۹] اٹلی 509، [۲۰] لاٹویا 95 ، [۲۱]لیتھن سٹس 528، [۲۲]لکزمبرگ 449، [۲۳]لیتھوانیا 143، [۲۴] مقدونیہ 208، [۲۵] مالدووا 341، [۲۶] آئس لینڈ 1227، [۲۷]ناروے 38، [۲۸] پولینڈ 328، [۲۹]پرتگال 285، [۳۰] رومانیہ 251، [۳۱] روس 22، [۳۲] سان مارینو 1197، [۳۳] سربیا 283، [۳۴] سلواکیہ 288، [۳۵] سلووانیہ 248، [۳۶]اسپین 208، [۳۷]سویڈن 56، [۳۸]سوئزرلینڈ 474، [۳۹]یوکرائن 208، [۴۰]برطانیہ 641۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ مسلمانوں کی آبادی میں اضافے سے رہنے کے لیے رقبہ کم ہوگیا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ "گھر اس کا بخارانہ بدخشاں نہ سمرقند" اور "اسے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز" "نشۂ مئے کو تعلق نہیں پیمانے سے" لہٰذا مسلمان ان علاقوں میں ہجرت کر کے آباد ہو جائیں گے جہاں ماں بچے پیدا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس سنگین صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے نئے ہزاریے کی آمد پر ایک محقق لکھتے ہیں:

نئی صدی کی آمد اور پرانی صدی کے اختتام پر عالمی ذرائع ابلاغ سے بار بار یہ اعلان کیا گیا کہ آنے والی صدی مغرب کے غلبے کی صدی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ تاریخ، تحقیق، تجزیہ اور اعداد و شمار کے مطابق یہ صدی مغرب کے غلبے کی آخری صدی ہے۔ مغرب اپنے افکار و نظریات کے ہاتھوں تیزی سے زوال کے سفر پر رواں دواں ہے۔ یہ سفر جو نیشنل ازم، کیپٹل ازم، لبرل ازم، ماڈرن ازم سے لے کر پوسٹ ماڈرن ازم تک آ پہنچا ہے۔ "انسان کی خدائی" کو ثابت کرنے کا سفر تھا۔ اس سفر کی ابتدا بھی عیسائیت کے عقیدہ الوہیت سے ہوئی کہ جہاں بندہ خدا بن جاتا ہے۔ اس عقیدے نے لبرل ازم کو یہ مذہبی جواز فراہم کیا کہ صرف ایک بشر ہی خدا کیوں ہو؟ ہر شخص اس مقام تک کیوں نہیں پہنچ سکتا لہٰذا بندے کو خالق کے مقام تک پہنچانے کا کام مغربی تہذیب نے اس تیزی سے کیا کہ تاریخ میں خودکشی کا ایسا عمل کبھی نہیں ہوا۔ خودکشی کے تین سو سالوں کی مختصر ترین تاریخ نطشے (Nietzche) اور فوکالٹ (Focault) مغرب کے دو بڑے فلسفیوں کے دو مختصر جملوں میں کفنا دی گئی ہے۔ نطشے نے کہا تھا خدا مر چکا ہے۔ فوکالٹ نے اعلان کیا انسان بھی مر گیا ہے اور یہ وہی انسان ہے جس کے بارے میں مشل فوکو نے کہا تھا کہ انسان تو اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوا یعنی وہ تمام لوگ انسان کہلانے کے مستحق نہیں جو سترہویں صدی سے پہلے دنیا میں پیدا ہوئے کیونکہ وہ دور ظلمات میں پیدا ہوئے تھے۔ جانے والی صدی کو سائنس کی صدی اور مذہب کی موت کی صدی کہا گیا مگر حقیقت یہ ہے کہ سائنس اپنی درماندگی کا اعتراف کر چکی ہے۔ سائنس کے بے سمت مسافر نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ دنیا کی ننانوے فی صد آبادی آج بھی مذہب کو نجات کا ذریعہ سمجھتی ہے اور مذہب سے تعلق میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔[۵۳]

نیا معبود: نئی عبادت:

یہ درست ہے کہ مغرب میں پرانی عبادت گاہیں کم ہو رہی ہیں۔ نئے معبود بنائے گئے ہیں نئے عبادت خانے بن رہے ہیں اور ان کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ [کیسینو، ہوٹل، سیر و سیاحت کے مقامات، شراب خانے، ریسورنٹ، کلب، چکلے، ننگوں کے کلب، ہم جنس پرستوں کے کوٹھے، چھوٹے بچوں اور جانوروں سے جنسی لذت حاصل کرنے والوں کے اڈے، فارم ہاؤس] جہاں خواہشات نفس کے الہ کی پرستش

ہورہی ہے۔ نفس الہ بن گیا ہے، اپنی ذات ہی سب کچھ ہوگئی ہے، خراج معاشرہ عقیدے کی جگہ لینے کی کوشش کر رہا ہے، اسراف اور صرف بے جا استغنا توکل اور صبر شکر کی اقدار کو مٹا رہے ہیں۔ اقدار کی موت کا مسئلہ درپیش ہے۔ ذاتی دکھ، درد میں اضافے اور خاندان کے خاتمے نے تشدد کو جنم دیا ہے۔ سننے والا کوئی نہیں ہے اور کہنے والے مار دیئے گئے ہیں، کہانیاں ختم ہوگئی ہیں۔[۵۴]

مغرب: جسمانی وجود کا مسئلہ:

مغرب کے لیے اگلی صدی کا سب سے بڑا مسئلہ اس کے وجود کے برقرار رہنے کا مسئلہ ہے سارے جوان آبادی میں تیزی سے کمی اور بوڑھی آبادی میں تیزی سے اضافے کا حقیقی خطرہ درپیش ہے جو جوہری بم کے خطرے سے زیادہ خطرناک ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی نے بانجھ تہذیب اور بے اولاد نسلوں کو جنم دیا ہے۔ ایک ایسی نسل جو ایثار و قربانی کی روایت سے انکاری ہے اور ماں بننے کے دکھ درد اٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے نتیجے میں آبادی کا زوال ہو رہا ہے اور سن دو ہزار پچاس تک پورا مغرب ۳۰ فی صد بوڑھوں پر مشتمل ہوگا جس کے نتیجے میں مغرب کا اقتصادی، دفاعی، معاشی اور سیاسی نظام زمین بوس ہو جائے گا۔ اس کے برعکس مغرب میں آباد مسلم اقوام تیزی سے آبادی کے خلاء کو پورا کریں گی، بالکل اسی طرح جس طرح لبنان میں ۱۹۴۸ تک عیسائی اور مسلمانوں کا تناسب آبادی ۶۵ اور ۳۵ تھا مگر ستر کی دہائی میں یہ شرح تناسب برعکس ہوگیا اور یہی تناسب لبنان کے کھنڈر بننے کا باعث بنا کیوں کہ جمہوریت کے فلسفے کے تحت عیسائی آبادی نے اکثریت کا حق حکمرانی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہی انکار مسلسل جنگ کا باعث بن گیا۔ اپنے فلسفے سے انحراف مغرب کا بنیادی فلسفہ ہے۔ مغرب کے فلسفے کی اصل بنیاد "فلسفہ لہو و لعب" ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "زندگی کھیل" ہے لہذا زندگی کو لہو و لعب میں گزارنا ہی اصل زندگی ہے۔[۵۵]

تہذیب کا پیمانہ: دولت، عورت:

مغربی ذرائع ابلاغ کے زیر اثر ہمارے اخبارات و جرائد میں جانے والی صدی کو زبردست خراج تحسین پیش کیا جا رہا ہے۔ طب، سائنس، ثقافت، عیش و عشرت، فنون لطیفہ، ابلاغی انقلاب، ادب، تاریخ، فلسفہ، معاشیات، ایجادات میں پیش رفت کے حوالے سے اس صدی کو مادیت پرستی کا مظہر سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ صدی صرف مادہ پرستی [Capitalization] ہی نہیں بلکہ مادہ پرستی [Philogeny] کے لحاظ سے بھی دنیا کی عجیب و غریب صدی تھی جہاں ہر شے دولت اور عورت کے پیمانے سے ناپی گئی مگر یہ دونوں پیمانے اس صدی کے انسان کے دکھ درد میں کمی نہیں کر سکے۔ اس صدی میں انسان نے دو عالمی جنگیں دیکھیں، سرد جنگ، گرم جنگ، اسلحہ کے ڈھیر، حیاتیاتی ہتھیار، جوہری دھماکے، قومی ریاستوں کا عروج، نئی آزاد ریاستیں جو غلامی سے نکلنے کے باوجود

ترین غلامی کا پیغام لائیں، سائنس نے بحر و بر اور ارض و سماء کو اپنے زہریلے افکار سے ہی نہیں زہریلے کیمیائی مادو ں سے آلودہ کردیا اور اب سانس لینے کے لیے صاف ستھری فضا بھی میسر نہیں ہے۔ فکری ارتقاء کے نعروں کے باوجود یہ صدی توازن سے محروم بلکہ سب سے زیادہ غیر متوازن صدی تھی جہاں انسانی رشتوں کی شناخت کھوگئی۔ یہ مخصوص اور فکر و نظر کے دھوکوں کی صدی تھی۔ آزادی، بنیادی حقوق، آزاد منڈی کی معیشت، اشتراکیت، انفرادیت، نجی ملکیت، قومی ملکیت، عالمی گاؤں کے بے شمار نعرے لگے اور دنیا فی الحقیقت کئی برس پہلے کے گاؤں میں تبدیل ہوگئی۔ دنیا کی تاریخ میں سب سے زبردست خون ریزی اس صدی میں مغرب کے ہاتھوں ہوئی دنیا کی تاریخ میں لڑی جانے والی جنگوں کے مقتولین کی کل تعداد سے کئی ہزار گنا زیادہ افراد پچھلی صدی میں مغرب کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان کی کل تعداد دس کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ اس کی ہولناک تفصیل ایک محقق کے قلم سے پڑھیے:

تین سو سال: دس کروڑ انسانوں کا قتل

سائنس کی ترقی اور صنعت و حرفت کے عروج کے گزشتہ تین سو سال اپنے دامن میں عالم انسانیت کے لیے بے پناہ مصائب، مشکلات اور تکالیف لے کر آئے۔ مغرب میں "خدا" کی جگہ انسان کی "الوہیت" کا اعلان انسان کے دکھ درد میں کمی کے بجائے بے پناہ دشواریاں لے کر آیا۔ خدا، مذہب اور روایات سے آزادی کے نام پر غلامی کی زنجیریں توڑ دینے والے مغرب نے "آزادی، خوشحالی، مسرت اور خوشیوں" کے نام پر دس کروڑ انسانوں کو ذبح کر ڈالا۔ جدیدیت اور پس جدیدیت (ماڈرن ازم اور پوسٹ ماڈرن ازم) کا سفر جو آزادی، اظہار ذات، فطرت پرستی، انسان پرستی، عقلیت پسندی، قوم پرستی سے شروع ہو کر لبرل ازم، مارکس ازم، ماڈرن ازم اور پوسٹ ماڈرن ازم کی پستیوں تک پہنچا۔ دراصل ناکامی اور پسپائی کا سفر تھا "خدا" کو معاشرے سے خارج کرنے کے بعد "خالق کی موت" کا اعلان کرنے والی مخلوق نے جلد ہی انسانیت، شرافت، تہذیب اخلاق روایات کو چن چن کر ہلاک کرنے کا تباہ کن عمل شروع کردیا۔ انسان نے انفرادی حیثیت میں الوہیت کا اظہار کیا تو وہ لبرل ہوگیا۔ "اجتماعی حیثیت میں اس کی الوہیت ظاہر ہوئی تو کمیونی ٹیرین ازم وجود میں آیا۔ "انسان انفرادیت کو اجتماعیت میں اس لیے ضم کردے کہ الوہیت انسانی کا حصول ممکن ہو" اس نعرے کے ذریعے قوم پرست کمیونسٹ اور سوشلسٹ وجود میں آئے۔ بظاہر مادہ پرستی کو روحانیت کا قالب دیا گیا مگر فی الحقیقت یہ روحانیت لفظی روحانیت تھی اور باطن میں شیطانیت ہی تھی۔ اسی لیے آج تک ان تمام افکار و نظریات کی کوئی واحد، جامع تعریف منظر عام پر نہ آسکی مگر اس کے بدلے دنیا کے طول و ارض میں لاکھوں لاشے کروڑوں انسانوں کی بھٹکتی ہوئی چیخیں، خاک و خون کا طوفان، ظلم اور بربریت کا سیل رواں اور لہو رنگ تاریخ کے بے شمار صفحات وجود میں آئے ہیں جس کی سطر سطر سے آہیں، آنسو اور لہو کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ مغرب جس نے سچ تک پہنچنے کے لیے واحد ذریعہ عقل کو قرار دیا

تھا عقل کے ذریعے تین سو سال تک تاریکیوں میں بھٹکتا رہا۔ اس سفر کے دوران چین، روس، امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، اسرائیل، کوریا، یوگوسلاویہ، ویت نام پر عراق، افغانستان، الجزائر، فلسطین، کشمیر میں تہذیب جدید کے نمائندوں نے ماڈرن ازم اور مارکس ازم کے نام پر دنیا کو دس کروڑ انسانوں کے خونی لاشے دیے۔

چھ ہزار سال کی تاریخ بمقابلہ تین سو سال

یہ تعداد بہت کم ہے کیوں کہ عالمی ذرائع ابلاغ مغرب کے قبضے میں ہیں مگر یہ کم تعداد بھی پوری دنیا کی تاریخ میں لڑی جانے والی تمام جنگوں کے مقتولین کی کل تعداد سے کئی ہزار گنا زیادہ ہے۔ نائن بی کے مطابق دنیا کی معلوم تاریخ ساڑھے چھ ہزار سال کی تاریخ ہے جس میں چھ ہزار سال مسلسل جنگوں کے سال ہیں لیکن ان چھ ہزار سالوں کے کل مقتولین کی تعداد مغربی تہذیب کے تین سو سال کے مقتولین کی تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ پاکستان اور دنیا بھر میں آباد جدیدیت پسند حلقے بار بار مذہبی حلقوں پر دشنام کے تیر برساتے ہیں اور مذہب اور خدا کو تاریخ کے عمل میں ایک رکاوٹ قرار دیتے ہیں مگر ان جدیدیت پسند حلقوں کو یہ معلوم نہیں کہ وہ جس مغرب کی وکالت کر رہے ہیں وہ کس قدر خونی، خون خوار، عیار، مکار، ظالم، شقی اور سنگدل ہے۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ ان خدا دشمن تہذیبوں، فلسفوں، قوموں اور معاشروں کے عروج سے پہلے دنیا بہت بہتر، بہت عمدہ اور بہت خوش حال تھی۔ مغرب کے نیچرل ازم، ماڈرن ازم، لبرل ازم، کمیونزم، سوشلزم، ریشنل ازم، نیشنل ازم سے پہلے اس زمین پر مذہب اور اہل مذہب کی حکمرانی تھی اور اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود وہ حکمرانی بہت بہتر بلکہ نہایت عالی شان تھی اس مذہبی حکمرانی کی چند جھلکیاں اسلامی تاریخ سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ خاتم المعصومین کی وفات تک مسلمان تیس لاکھ مربع کلومیٹر رقبے پر غالب آ چکے تھے مگر اتنی عظیم الشان فتوحات میں مسلمانوں کے صرف ڈیڑھ سو افراد شہید ہوئے اور مزاحمت کرنے والے گروہوں میں سے صرف چند سو افراد ہلاک ہوئے۔ امن، صلح اور محبت کی ایسی کوئی مثال مغرب کے یہاں دستیاب ہے؟

حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ سے لے کر خلافت عثمانیہ تک اسلامی ریاست دنیا کے طول و عرض میں آٹھ سو برس تک پھیلتی رہی مگر اس آٹھ سو برس کی تاریخ میں مسلم اور غیر مسلم مقتولین و شہداء کی کل تعداد پانچ ہزار سے زیادہ نہیں رہی۔ محمد بن قاسم نے ہندو پاک کا بہت بڑا علاقہ فتح کیا جو کئی لاکھ مربع میل پر مشتمل تھا لیکن مقتولین کی تعداد صرف چند سو افراد تک محدود رہی مگر صلیبی جنگوں میں اور چنگیزی حملوں میں دنیا نے لاکھوں انسانوں کو خون میں نہاتے ہوئے دیکھا۔ مغربی تہذیب دراصل صلیبی تہذیب اور چنگیزی تہذیب ہے جو کہ دنیا کو انسانیت کا درس تو دیتی ہے مگر خود انسانیت سے محروم ہے مسلمانوں کے شہر بغداد پر حملے میں ۳۵ لاکھ افراد کو شہید کیا گیا تھا مگر عالم اسلام کے ہاتھوں آج تک اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کا کبھی اور کہیں قتل عام نہیں ہوا۔

مغرب کی مختلف جنگوں میں ہلاک شدگان: اعداد و شمار کی روشنی میں

(۱) انگلستان و فرانس کی جنگ ۱۱۵ سالہ اس جنگ میں لاکھوں آدمی مارے گئے۔

۱۳۳۸ء سے ۱۴۵۳ء تک اور جنگ ۱۶۱۸ تا ۱۶۴۸ء تک

(۲) جرمنی، فرانس، آسٹریلیا، سویڈن ۳۰ برس کی جنگ میں صرف جرمنی کے ایک کروڑ بیس لاکھ آدمی مارے گئے، یورپ کی دو تہائی آبادی ہلاک ہوگئی جو باقی بچی اس کی حالت نہایت ابتر تھی۔

دیہاتوں کا ۵/۶ فی صد حصہ تباہ ہوگیا تھا۔ شمال کے علاقوں کی ایک تہائی اراضی پر کوئی کاشت کار باقی نہ رہا۔ بھیڑیوں کے جھنڈ مردوں کے گوشت کھاتے پھرتے تھے۔

جنگ کی تباہ کاری کے باعث پیرس کی ایک چوتھائی آبادی بھکاریوں پر مشتمل تھی، فرانس کی نصف دیہاتی آبادی فاقہ کشی کا شکار تھی۔ فقیروں کے لشکر امراء کے گھروں کے گرد بھیک کے لیے جمع رہتے۔ ان سے بچنے کے لیے امراء نے شکاری دستے ترتیب دیے جو ان فقیروں کو ہلاک کر دیتے تھے۔

(۳) امریکی خانہ جنگی ۱۸۶۰ تا ۱۸۶۵ء تک جاری رہی

اس میں ایک فریق شمالی ریاستیں اور دوسرا فریق جنوبی ریاستیں تھیں۔ جنگ کا سبب غلامی کا مسئلہ تھا اس میں تین لاکھ آدمی شمالی ریاستوں کے اور پانچ لاکھ جنوبی ریاستوں کے مارے گئے۔ ایک ارب پونڈ اخراجات ہوئے۔

(۴) ۱۷۰۰ء سے ۱۸۷۲ء تک یورپ میں ۱۲۰ جنگیں لڑی گئیں۔

جن میں سے صرف دس مرتبہ رسمی اعلان جنگ ہوا۔ ان جنگوں میں لاکھوں آدمی مارے گئے۔

(۵) روس نے کمیونزم کے ابتدائی ایام میں ۱۹ لاکھ افراد کو سزائے موت دی، ۲۹ لاکھ لوگوں کو مختلف سزائیں دی گئیں، پچاس لاکھ افراد کو جلاوطن کیا گیا۔ مشرقی یورپ میں کمیونسٹوں کے ہاتھوں مرنے والوں کی تعداد جن میں لیبر کیمپوں میں مقید یورپی قیدی بھی شامل ہیں ۲۶ لاکھ سے زیادہ ہے۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق روس کے سرخ انقلاب سے لے کر ۱۹۸۰ء تک کل ۶۸ لاکھ افراد قتل کیے گئے۔

(۶) کوریا کی معمولی سی جنگی کشمکش میں صرف دو سال کے اندر ۵۰ لاکھ مرد عورتیں اور بچے ہلاک ہوئے۔ اس وقت کوریا کی معاشی بدحالی کا یہ حال ہے کہ ۵۰ لاکھ لوگ صرف قحط اور بھوک سے ہلاک ہو چکے ہیں اس جنگ میں ایک کروڑ افراد زخمی ہوئے۔

(۷) چین میں کمیونزم کے نفاذ کے لیے ڈیڑھ کروڑ زمینداروں کو پھانسی دی گئی اور لاکھوں افراد ہلاک کیے گئے۔

(۸) امریکہ کی جانب سے پابندی کے باعث پانچ لاکھ عراقی باشندے موت کے منہ میں چلے گئے۔

(۹) ویت نام کی جنگ میں ۷۰ لاکھ آدمی مارے گئے مغرب کی مسلط کردہ

(۱۰) افغانستان کی جنگ میں ۲۰ لاکھ آدمی مارے گئے مغرب کی مسلط کردہ

(۱۱) فلسطین کی جنگ میں ۷ لاکھ افراد مارے گئے مغرب کی مسلط کردہ

(۱۲) ایران عراق جنگ میں ۱۲ لاکھ افراد مارے گئے مغرب کی مسلط کردہ

(۱۳) الجزائر میں فرانس نے ۷۰ لاکھ افراد قتل کیے تاکہ آزادی کو روکا جاسکے اس وقت اسلامک فرنٹ کے دو لاکھ آدمی قتل کردیے گئے ہیں۔

(۱۴) یوگوسلاویہ کو توڑنے کے لیے آئی ایم ایف اور مغرب نے سرب اور کروشیائی قومیتوں کا زہر بھر کر ۳۰ لاکھ انسانوں کو بے گھر اور دس لاکھ انسانوں کو قتل کر ڈالا۔

(۱۵) عراق، کویت جنگ مغرب کی مسلط کردہ جس میں دس ہزار لوگ مارے گئے۔

(۱۶) ۱۹۷۱ء سقوط پاکستان کی تیرہ لاکھ آدمی مارے گئے۔

(۱۷) روس کی مختلف ریاستوں میں جاری جنگیں جن میں ہزاروں لوگ مارے جارہے ہیں۔

1854 تا 1905ء یورپ میں لڑی گئی جنگیں

اوران میں ہونے والا جانی و مالی نقصان ایک نظر میں

یورپ میں جنگ کریمیا 1854ء کے زمانے سے 1905ء تک جولڑائیاں ہوئیں اوران میں جو جانی اورمالی نقصان ہوااس کا اندازہ ذیل میں دیے گئے نقشے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

نام جنگ	سال	جانی نقصان	مالی نقصان
جنگ کریمیا	1854ء	780000	340ملین
جنگ آزادی غلامان امریکہ	1871-1861	800000	1400ملین
جنگ فرانس وجرمنی	1871-1870	853000	560ملین
جنگ روس وترکی	1877ء		
جنگ امریکہ واسپین	1898ء		259ملین
جنگ ٹرانسوال	1902-1899	68700	2700ملین
جنگ روس وجاپان	1905- 1904	485000	503ملین

جنگ بلقان کے مختلف فریق

نام جنگ	جانی نقصان	مالی نقصان
جنگ بلغاریہ	14/00000	0090ملین
جنگ سربیا	070000	0050ملین
یونان	030000	00251ملین
مونٹی نیگرو	00800	0001ملین

جنگ عظیم اوّل کے ہلاک شدگان
اعداد و شمار کی روشنی میں

نام ملک	تعداد لفظوں میں	تعداد مقتولین و مجروحین ہندسوں میں
روس	سترہ لاکھ	1700000
جرمنی	سولہ لاکھ	1600000
فرانس	تیرہ لاکھ ستر ہزار	1370000
اٹلی	چار لاکھ ساٹھ ہزار	460000
آسٹریا	آٹھ لاکھ	800000
برطانیہ	سات لاکھ	700000
ترکی	دو لاکھ پچاس ہزار	250000
بلجیم	ایک لاکھ دو ہزار	102000
بلغاریہ	ایک لاکھ	100000
رومانیہ	ایک لاکھ	100000
سربیا مونٹی نیگرو	ایک لاکھ	100000
امریکہ	پچاس ہزار	50000
میزان	تہتر لاکھ اڑتیس ہزار	7338000

جنگ عظیم دوم کے ہلاک شدگان

اعداد و شمار کی روشنی میں

نام ملک	تعداد لفظوں میں	تعداد مقتولین و مجروحین ہندسوں میں
روس	دو کروڑ دس لاکھ	21000000
جرمنی	سولہ لاکھ	1600000
پولینڈ	نو لاکھ	900000
چین	تیس لاکھ	3000000
جاپان	ستائس / پچاس لاکھ	27/50/00000
آسٹریا	سات لاکھ	700000
رومانیہ	سات لاکھ	700000
فن لینڈ	ایک لاکھ تراسی ہزار	183000
چیکوسلواکیہ	ساٹھ ہزار	60000
سلاواکیہ	تیس لاکھ پچاس ہزار	3050000
امریکہ	دس لاکھ ستر ہزار	1070000
برطانیہ	چودہ لاکھ تیس ہزار	1430000
فرانس	دس لاکھ	1000000
اٹلی	گیارہ لاکھ	1100000
یوگوسلاویہ	سولہ لاکھ پچاسی ہزار	1685000
ہنگری	چھ لاکھ	600000
ہالینڈ	دو لاکھ پچھتر ہزار	275000
بلجیم	ساٹھ ہزار	60000
فلپائن	تیس ہزار	30000
میزان	چار کروڑ چونتیس لاکھ تینتالیس ہزار گیارہ	4,34,43011

[۵۶]

مغرب کے ظلم و تشدد کی ایک طویل تاریخ ہے مثلاً (۱) انقلاب فرانس کے دوران جو تشدد ہوا، اور بانیان انقلاب نے کیا کیا ظلم ڈھائے [بیشتر انقلابی اور مفکر یا یہودی تھے یا فری میسن] (۲) ہٹلسٹوں نے روس اور بلقان کی ریاستوں اور دیگر ممالک میں کس طرح دہشت گردی کی اور قتل عام کیا۔ [ہٹلسٹ تحریک پر بھی یہی الزام ہے کہ اس کی فکری باگ ڈور یہودی صیہونیوں کے ہاتھ میں تھی] (۳) ۱۹۰۵ء کے ناکام انقلاب سے پہلے اور بعد میں روس میں بقلم خود سوشلسٹ سیاسی جماعتوں نے کس طرح کس طرح ظلم کیا اور مخالفین کو تہس نہس کیا۔ [بیشتر سیاسی جماعتوں کی سربراہی یہودیوں کے پاس تھی] (۴) بالشویکیوں نے روس میں انقلاب کے بعد سے لے کر اور سوویت یونین کے خاتمہ تک سابق سوویت یونین میں جو قتل عام کیا۔ [بالشویک انقلاب کے بانی یعنی ولادی میرالیچ لینن سمیت پہلی مرکزی کمیٹی کے ۹۰ فیصد اراکین یہودی تھی۔] اس کے علاوہ سابق مشرقی یورپ کی ریاستوں میں کیا کچھ نہیں کیا؟ بھارت میں پچھلے ۵۷ برسوں سے کیا ہو رہا ہے۔ چین میں سرخ انقلاب کے نام پر کتنے لاکھ انسانوں کا قتل عام ہوا یہ سب مغربی تہذیب کے مظاہر ہیں کیوں کہ سرمایہ داری کی انفرادی صورت لبرل ازم ہے اور اس کی اجتماعی شکل سوشلزم، کمیونزم، نیشنل ازم، ہیومن ازم، ڈیموکریسی، سوشل ڈیموکریسی وغیرہ ہیں۔

جمہوریت اور قتل عام: فطری تعلق

مائیکل مین تو جمہوریت اور نسل کشی میں ایک فطری تعلق تلاش کرتا ہے اس کی تحقیق کے مطابق جمہوری معاشروں نے اب تک دنیا کو چھ کروڑ لوگوں کی لاشیں دی ہیں۔ جمہوریت رواداری کے بجائے تشدد، دہشت گردی، نسل پرستی اور نسل کشی کا سب سے خوبصورت، موثر اور مہذب ہتھیار ہے۔

اگر یہی انسانیت کا عروج ہے تو اس سے زوال بہت بہتر ہے۔ گزرنے والی صدی میں قومی ملکیت کا روس تباہ ہوا چین نے نجی ملکیت کا سفر اختیار کیا۔ درحقیقت یہ صدی قومی حکومتوں اور نجی ملکیت کی صدی نہیں پانچ سو کثیر القومی اداروں کی صدی ثابت ہوئی (ملٹی نیشنل کمپنیوں) نے لبرل ازم، کیپٹل ازم کے نام پر (۱) دنیا کی ۴۲ فی صد دولت صرف پانچ سو کثیر القومی اداروں کے قبضے میں ہے، (۲) دنیا کے سو بڑے اقتصادی اداروں میں پچاس کے قریب ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں، (۳) پچاس بڑی کمپنیاں ایسی ہیں جو دنیا کے سو چھوٹے ممالک کے کل اثاثوں سے بھی زیادہ دولت رکھتی ہیں، (۴) شیل کمپنی کے پاس دنیا کی چالیس کروڑ ایکڑ زمین ہے جو اس کی ملکیت ہے یا لیز پر حاصل کی گئی ہے، (۵) برطانیہ کی پچاس کمپنیاں وہ سب کچھ فراہم کرتی ہیں جو ہم کھاتے ہیں یا استعمال کرتے ہیں، (۶) جنرل موٹرز کا سالانہ بجٹ ایک سو تینتیس ارب ڈالر ہے جو تنزانیہ، ایتھوپیا، نیپال، بنگلہ دیش، زائرے، یوگینڈا، نائجیریا، کینیا اور پاکستان کی مجموعی قومی پیداوار کے برابر ہے (۷) اس کا مطلب یہ ہے کہ پچاس کروڑ انسانوں کا بجٹ صرف ایک کمپنی جنرل موٹرز کے پاس ہے (۸) دس کارپوریشنیں دنیا بھر میں خوراک کے نظام کی

مالک ہیں جبکہ چار کمپنیوں نے نوے فی صدی کھیل اور اس سے متعلق صنعت پر قبضہ کر رکھا ہے (۹) یہی کمپنیاں اناج، گندم، کافی، چائے، کپاس، تمباکو، پٹ سن اور جنگی مصنوعات کی برآمدات پر قابض ہیں (۱۰) یہی چار کمپنیاں خوراک کی اسٹوریج، نقل وحمل اور پراسیسنگ کی مالک ہیں (۱۱) اپنے بڑھتے ہوئے اختیارات اور قوت کے باعث یہ ادارے حکومتوں سے زیادہ طاقتور ہو چکے ہیں اور یہ طاقت کسی معاشرتی ذمہ داری کے تصور سے عاری ہے اور ان کا بنیادی مقصد اپنی تجارت کو بہر صورت نمو پذیر رکھنا ہے (۱۲) عالمی تجارت کا نظام اب حکومتوں کی سطح سے منتقل ہو کر کارپوریشنوں کے قبضے میں آ گیا ہے اور طاقت، قوت و اختیارات کے مراکز تیزی سے حکومت کی بجائے کارپوریشنوں کو منتقل ہو رہے ہیں (۱۳) ان اداروں کی قوت و طاقت میں دن بہ دن اضافے کا مطلب صرف ایک ہے وہ یہ ہے کہ عام آدمی اور حکومتوں کی طاقت، قوت اختیار میں دن بہ دن تیزی سے کمی قومی ریاستوں کا خاتمہ مقامی حکومتوں کا فروغ جو ملٹی نیشنل کمپنیوں کی غلام بن جائیں گی۔ (۱۴) ماضی میں لوگ صرف چند کارپوریشنوں کو سیاسی اداروں کے طور پر دیکھتے تھے مگر اب تمام کارپوریشنیں عالمی سیاست پر اثر انداز ہونے لگی ہیں اور کچھ کارپوریشنوں نے اس امر کا جائزہ لیا ہے کہ ان کے طرز عمل کا معاشرے پر کیا اثر پڑا ہے مگر بیشتر کارپوریشنوں کو اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے (۱۵) یہ ادارے بہت سی قومی حکومتوں سے زیادہ طاقتور ہیں دنیا کی کوئی حکومت جنرل موٹرز، فوڈز اور اے ٹی این ٹی کی طرح بیک جنبش قلم چالیس ہزار لوگوں کو ملازمت سے برطرف کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی (۱۶) سیاسی حکومتیں اقتصادی قوتوں کی پیروی پر مجبور ہوتی ہے اور حکومتوں کی حکمت عملی ان اداروں کے مفادات کی تابع ہوتی ہے (۱۷) دنیا بھر میں قومی حکومتیں، معاشرتی خدمات کے تمام ادارے ملٹی نیشنل کمپنیوں کو منتقل کر رہی ہیں جن میں صحت، پنشن، جیلیں، جرائم کی روک تھام جیسے معاملات بھی ان اداروں کے سپرد کر دیے گئے ہیں (۱۸) دنیا بھر میں طاقت کے نئے مراکز قائم ہو چکے ہیں ورلڈ ٹریڈ آرگنا ئزیشن (W.T.O) اور نارتھ امریکہ فری ٹریڈ ایسوی ایشن (N.A.F.T.A) اقتصادی امور میں فیصلہ کن طاقت حاصل کر چکے ہیں اور کروڑوں لوگوں کی زندگی ان اداروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دی گئی ہے۔ ISO 2000 وغیرہ استعماریت کی نئی اور خطرناک ترین شکل ہے۔ دنیا کی قسمت اب W.T.O اور N.A.F.T.A کے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ انسان ملکوں اور قوموں کی غلامی سے نکلنے کے بعد ملٹی نیشنل کمپنیوں کا غلام بن گیا ہے۔ یہ پرانے اعداد و شمار تھے ۲۰۰۴ء کے نئے اعداد و شمار کا جائزہ ''گارڈین نیوز سروس'' کے John Vidal کے مطابق: درج ذیل ہے:

As 50000 people marched through Porto Alegre, in southern Brazil, to mark the opening of the annual World Social Forum on

developing countries' issues. The report from ActionAid was set to highlight that how power in the world's food industry has become concentrated in a few hands.

The report says that 30 companies, now account for a third of the world's processed food; five companies control 75% of the global pesticide market.

It finds that two companies dominate sales of half the world's bananas, three 85% trade of the world's tea, and one, Walmart, now controls 40% of Mexico's retail food sector. It also found that Monsanto controls 91% of the global GM seed market.

Household names like Nestle, Monsanto, Unilever, Tesco, Walmart, Bayer and Cargill are all said to have expanded hugely in size, power and influence in the past decade directly because of the trade liberalization policies being advanced by the USA and other G8 countries whose leaders are meeting this week in Davos.

"A wave of mergers and business alliances has concentrated market power in few hands," the report says.

It accuses the companies of shutting local companies out of the market, driving down prices, setting international and domestic trade rules to suit themselves, imposing tough standards that poor farmers cannot meet, and charging consumers more.

The report says that the 85% of all the recent fines imposed on global cartels were paid by agri-food companies, with three of them forced to pay out 500 million US dollars to settle price fixing laws uits.

The ActionAid report argues that many food behemoths are wealthier than the countries in which they do their business. Nestle, it says, recorded profits greater than Ghana's GDP in 2002, Unilever

profits were a third larger than the national income of Mozambique and Walmart profits are bigger than the economies of both countries combined. The companies are also said to be taking advantage of the collapse in farm price. Price for coffee, cocoa, rice, palm oil and sugar have fallen by more than 50% in the past 20 years. [Dawn, 29 Jan. 2005]

مغرب: خاندان کا ادارہ:

زبانوں کے قتل عام کے سلسلے میں استعماریت کے کردار کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ مباحث ناگزیر ہیں مغرب اس عہد کا الٰہ بننے کی کوشش کر رہا ہے لہٰذا زبانوں، نسلوں کی زندگی اور موت کے فیصلے کا اختیار بھی اسے حاصل ہوگیا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب انسان کا رشتہ روح کے بجائے جسم سے، عقیدہ کے بجائے عقل سے، داخل کے بجائے خارج سے، خالق کے بجائے مخلوق سے، قربانی کے بجائے مفاد پرستی سے، ایثار کے بجائے لذت اندوزی سے جوڑتی ہے۔ وہ دنیا کو عروج و اقبال کے پیمانے سے ناپتی ہے جبکہ اسلام انسان کی پیدائش کا مقصد، ''اپنے رب کی عبادت'' کے سوا کچھ اور نہیں بتاتا۔ یہ عبادات ہی انسان کے اندر عاجزی، فروتنی، ملنساری، سادگی، دلداری، خاکساری اور قربانی کا جذبہ پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں خاندان بنتے ہیں، نسلیں جنم لیتی ہیں اور زبانیں پروان چڑھتی ہیں۔

مغرب کی آبادی میں تیزی سے کمی کے مسئلے کا حل امریکی ویزا لاٹری کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ ماہر جنیات ڈاکٹر شکیل الرحمان فاروقی اس کا تجزیہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

DV ویزا لاٹری: کیا ہے؟

''امریکی ویزا لاٹری'' کیا ہے؟ اس حقیقت سے عوام مکمل طور پر بے خبر ہیں، کم لوگ جانتے ہیں کہ امریکی ویزا لاٹری دراصل سفید فام نسل میں پیدا ہونے والے بے شمار طبی مسائل کا ایک علاج ہے۔ یہ درحقیقت نسلی برتری قائم رکھنے کے لیے ایک ایسا جینیاتی سفر ہے جو امریکہ کو اپنی عالمی حکمرانی برقرار رکھنے کے لیے طوعاً کرہاً ان نسلوں کے ساتھ طے کرنا پڑتا ہے جنہیں وہ نسلی اعتبار سے کمتر و فروتر سمجھتے ہیں۔ یہ دیگر نسلوں کو ''جینیاتی تغیر'' میں شامل کر کے اپنی نسل کو تفوق دینے کے لیے اگلی صدیوں کی پیشگی منصوبہ بندی ہے، جسے امریکی ماہرین مسلسل غور و فکر کے بعد ترتیب دیتے رہے ہیں۔ لہٰذا امریکی ویزا لاٹری کی اصل حقیقت سے باخبر ہونا نہایت ضروری ہے۔

تفصیلات کے مطابق ۱۹۹۰ء میں امریکہ نے ایک امیگریشن ایکٹ پیش کیا جس کے تحت ہر سال پچپن ہزار افراد کو لاٹری کے نظام کے تحت مستقل رہائشی ویزے دیے جانے لگے۔اس پروگرام کو "سالانہ تنوع [ڈائیورسٹی](DIVERSITY)امیگریشن پروگرام" کہا جاتا ہے۔اس عنوان میں سب سے اہم لفظ ڈائیورسٹی ہے۔ڈائیورسٹی ایک ایسا قدرتی عمل ہے جو ابتداء سے ہی اس زمین کے ارتقاء میں کارفرما رہا اور آج بھی غالباً دنیا کی موجودہ ترتیب میں سب سے کامیاب قوم کا مطلوبہ ہتھیار ہے۔اسی لیے امریکہ بھی عالمی حکمرانی کے لیے امریکن ڈائیورسٹی ویزا لاٹری کا سہارا لے رہا ہے۔

امریکی حکومت دنیا کے چھ جغرافیائی حصوں کے انسانوں کو اس بنیاد پر ویزا دیتی ہے کہ پچھلے پانچ برسوں میں وہاں سے پچپن ہزار سے کم افراد نے امریکہ نقل مکانی کی ہو۔آخر امریکی حکومت کیوں اس قدر مہربان ہے اور کس مقصد سے یہ ویزے دیے جا رہے ہیں؟یہ وہ سوال ہے جس کا جواب سائنس دیتی ہے۔

گدھے اور گھوڑے تو الگ الگ نوع کے جانور ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدرتاً وہ نسل جس میں تغیر زیادہ ہو اور کردار و خواص کے وسیع درجات موجود ہوں ارتقاً کے عمل میں وہ نسل زیادہ مضبوط،توانا اور مقبول ہوتی ہے اور موسمی اور وبائی اثرات کا زیادہ بہتر طریقے سے مقابلہ کرتی ہے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض قبائل اور خاندان آپس میں ہی شادیاں کرتے رہتے ہیں نتیجتاً چند نسلیں گزرنے کے بعد کردار و خواص میں تغیر محدود رہ جاتا ہے اور نسل کمزور ہو جاتی ہے۔

دراصل تمام جاندار کے خواص کردار ان کے خلیوں میں موجود مخصوص اجزا جنہیں جینز کہا جاتا ہے، متعین کرتے ہیں۔یہ جینز کروموسوم کی شکل میں موجود ہوتے ہیں جو خوردبین کے ذریعے دیکھے جا سکتے ہیں۔ہر انسان کے خلیوں میں کروموسوم کی کل تعداد ۴۶ ہوتی ہے جن میں ۲۳ ماں سے اور ۲۳ باپ سے اولاد میں منتقل ہوتے ہیں اور انہی کے ملاپ سے اولاد میں ماں باپ کی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں۔اب اگر کسی جوڑے کے دادا اور دادی ایک ہی ہوں تو اس کی اولاد کے خواص و کردار میں تغیر محدود رہ جائے گا جبکہ دو مختلف خاندانوں کے ملاپ سے یہ تغیر وسیع ہو جائے گا۔اسی طرح مختلف نسلوں کے اختلاط سے حاصل ہونے والا تغیر اور زیادہ وسیع ہو گا۔

امریکہ میں بھی یورپ کی طرح غالب نسل سفید فام ہے اور یہ نسل دیگر نسلوں کے مقابلے میں زیادہ تر اپنے ہم نسلوں میں ہی شادیاں کرتی ہیں۔یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔آج امریکی قوم جدید سائنس کے حوالے سے سب سے آگے ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے اسے ہی یہ خیال آیا کہ مختلف النسل انسانوں کے اختلاط سے جینیاتی تغیر کو امریکی قوم میں وسعت دی جا سکتی ہے اور یہ جینیاتی تغیر اس قوم کی بقاء اور ارتقائی ترقی میں معاون ثابت ہو گا۔

عالم مغرب کی شرح افزائش: سب سے کم

مغربی تہذیب کو آبادی میں تیزی سے کمی کا سامنا ہے لہٰذا چند دانشور یہ پیش گوئی کر رہے ہیں کہ یہ اس کے عروج کی آخری صدی ہے؟ یہ نہ کسی دیوانے کے بڑ ہے اور نہ ہی کوئی پیشین گوئی ہے جس کی کامیابی ناکامی کا مساوی امکان ہو بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی طرف ہماری رہنمائی مغرب کے پروردہ علوم خود کر رہے ہیں۔ ان علوم میں اہم ترین علم شماریات ہے۔ انیسویں صدی سے لیکر اب تک اور اس سے پہلے بھی مغرب نے اپنے تسلط کو قائم رکھنے کے لیے علم شماریات پر بہت زیادہ انحصار کیا ہے۔ آج یہی شماریات مغرب کے زوال کی یقینی منزل کی طرف واضح اشارے کر رہی ہے۔

اگر تہذیبوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اپنے زوال کے امکان کے بارے میں مغرب سے زیادہ حساس تہذیب شاید ہی کوئی اور مل سکے۔ اس صدی میں مغرب کے زوال کے امکان کے بارے میں ان امکانات کو رفع کرنے کے سلسلہ میں مغرب کے فلسفیوں، مفکروں، مورخوں نے کیا کچھ نہیں لکھا ہے!

مغرب کے شہر: غیر گوروں کی کثرت:

اس وقت جو مسئلہ مغرب کے لیے ایک حقیقی خطرہ اور رلا نچل عقیدہ کے طور پر سامنے آیا ہے وہ آبادی کا مسئلہ ہے۔

ا۔ مغرب میں بوڑھے افراد کا کل آبادی میں حصہ ہوش ربا حد تک بڑھ رہا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مغربی معاشروں میں کھانے والے پوت، ہوش ربا حد تک کم ہو رہے ہیں جبکہ اس کمائی کو بیٹھ کر کھانے والے افراد بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔

ب۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ مغرب میں نئے بچے پیدا نہیں ہو رہے ہیں۔ مغرب میں زیادہ تر ممالک کی شرح آبادی میں اضافہ منفی ہے (سال میں جتنے افراد مرتے ہیں ان سے کم بچے اس سال پیدا ہوتے ہیں) یا مستقبل قریب میں منفی ہو جائے گا۔ [اعداد و شمار پچھلے صفحات میں دیے گئے ہیں]

ج۔ مزید براں یہ کہ وہ ممالک جو کہ مغرب کے لیے خطرہ ہیں ان میں آبادی میں اضافہ نہایت تیزی سے ہو رہا ہے اور ان معاشروں میں نوجوانوں کی تعداد بوڑھوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ خصوصاً مسلم ممالک میں۔

د۔ کیوں کہ مغرب کی آبادی میں نوجوانوں کی تعداد روز بروز کم ہو رہی ہے اس لیے اسے کارکنوں کی تعداد میں کمی کا سامنا ہے یہی وجہ ہے کہ تمام تر تامل کے باوجود مغرب اس بات پر مجبور ہے کہ تیسری دنیا سے مزدوروں اور کارکنوں کو درآمد کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ تاریخ میں پہلی مرتبہ مغرب کے قلب میں اس کے شہروں اور محلوں میں اس کی تہذیب کے امکانی دشمنوں کی تعداد میں روز بروز نہایت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ مثلاً ایک

تازہ سروے کے مطابق گوری آبادی لندن سے نقل مکانی کر رہی ہے اور ۲۰۰۱۵ تک لندن میں ہر دوسرا آدمی غیر گوری نسل کا ہوگا۔

بوڑھی آبادی خطرناک بوجھ:

ان چاروں جہات نے اس مسئلہ کو ایک تہذیبی مسئلہ بنا دیا ہے۔ آبادی کا یہ مسئلہ مغرب کو معاشی اور دفاعی طور پر دیوالیہ کر رہا ہے۔

ا۔ معاشی اعتبار سے بوڑھوں کی آبادی میں اضافہ اور نوجوانوں کی تعداد میں کمی کے نتیجہ میں کھانے والوں اور کمانے والوں کے درمیان عدم توازن اس حد تک خطرناک ہوتا جا رہا ہے کہ مستقبل میں مغرب کے پاس سرمایہ کاری کے لیے پیسہ نہیں بچ پائے گا اور اس کے نتیجہ میں سرمایہ کی گردش جمود کا شکار ہو جائے گی۔ عالمی سرمایہ داری اس بوجھ کو زیادہ عرصہ اٹھا نہیں پائے گی اور بالآخر تباہ و برباد ہو جائے گی۔

ب۔ دفاعی نقطہ نظر سے نوجوانوں کی تعداد میں کمی کے نتیجہ میں مغرب اس قابل نہیں رہے گا کہ لمبی زمینی جنگیں لڑ سکے۔ معاشی کسمپرسی کے نتیجہ میں وہ اس قابل بھی نہیں رہے گا کہ دفاعی مہم جوئی کر سکے۔ اس کے نتیجہ میں مغربی استعمار کی گرفت آہستہ آہستہ کمزور ہوتی چلی جائے گی۔

ج۔ معاشی دباؤ کے نتیجہ میں مغرب اس قابل نہیں رہے گا کہ ترقی پذیر ممالک یا غریب ممالک میں سرمایہ کاری کر سکے یا انہیں قرضے فراہم کر سکے۔ اس کے نتیجہ میں مغرب اس اہم ہتھیار سے محروم ہو جائے گا جس کے بل بوتے پر وہ ان ممالک میں اپنی استعماری خواہشات کو روبہ عمل لایا کرتا تھا۔

بوڑھی تہذیب، بوڑھی نسلیں:

☆ پانچ ہزار سال کی انسانی تاریخ میں انسانی معاشروں میں بوڑھوں کا تناسب (بوڑھوں سے ہماری مراد ۶۵ سال یا اس سے زیادہ عمر کے افراد ہیں) دو سے تین فیصد تک رہا ہے۔ یہ صورتحال اٹھارویں صدی تک قائم رہتی ہے۔ اٹھارویں صدی مغربی تہذیب کے عروج کی صدی ہے۔ جب مغربی تہذیبی آدرش انفرادی رویوں اور اجتماعی اقدار میں رچنے بسنے لگیں۔ اس کے نتیجہ میں آبادی کے تناسب میں تغیر آنا شروع ہوا۔ آج صورتحال یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک (یعنی مغربی ممالک) میں بوڑھے افراد کا تناسب چودہ فیصد ہو چکا ہے اور مستقبل میں یہ تناسب مزید بڑھتا جائے گا۔

بوڑھے معاشرے بوڑھی تہذیب:

☆ آبادی کے تناسب میں اس زبردست تغیر کا ایک پیمانہ فلوریڈا ہے۔ فلوریڈا امریکہ کی وہ ریاست ہے کہ جس

میں امریکہ کے بڑے بوڑھے ریٹائر ہونے کے بعد آ کر بس جانا پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلوریڈا میں بوڑھوں کا آبادی میں تناسب ساری دنیا سے زیادہ ہے۔ فلوریڈا کی کل آبادی میں بوڑھوں کا تناسب انیس فیصد ہے۔ اور عنقریب مغربی ممالک بہت جلد ہی فلوریڈا کے اس امتیاز و اختصاص کو ختم کردیں گے۔ وہ دن زیادہ دور نہیں ہے جب مغرب کا ہر ملک فلوریڈا بن جائے گا۔ اٹلی یہ اعزاز بخش ۲۰۰۳ء میں حاصل کرے گا، جاپان ۲۰۰۵ء میں اور جرمنی ۲۰۰۶ء میں اس کا مستحق ٹھہرے گا۔ فرانس اور برطانیہ کی بوڑھوں کی آبادی ۲۰۱۶ء تک فلوریڈا کے (۱۹فیصد) کے ہدف کو چھولے گی۔ امریکہ اور کینیڈا بالترتیب ۲۰۲۱ء تک اس ہدف کو چھولیں گے۔

☆ فلوریڈا کے اس ہدف کو چھولینے کے بعد بات وہاں پر رُک نہیں جائے گی۔ ۲۰۳۰ء تک مغربی ممالک میں بوڑھوں کی تعداد آبادی کا ۲۵ فی صد ہو جائے گی جبکہ کچھ ممالک ۳۰ فی صد کے ہدف کو چھو جائیں گے۔

☆ پانچ ہزار سال میں انسانی معاشروں میں (جن میں موجودہ مغربی ممالک بھی شامل ہیں) بوڑھوں کا تناسب دو سے تین فی صد رہا ہے۔ مغربی ممالک میں ۲۰۳۰ء تک یہ تناسب ۳۰ فی صد ہو جائے گا۔ ہم تاریخ انسانی کے سب سے زیادہ بوڑھے معاشروں اور سب سے زیادہ بوڑھی تہذیب کی گرفت میں ہیں۔

بوڑھوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ:

☆ مغربی ممالک میں لوگوں کی عمروں میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ۸۵ سال یا اس سے زائد کی عمر کے لوگوں میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اقوام متحدہ کے شماریاتی اندازوں کے مطابق ۲۰۵۰ء تک دنیا بھر میں ۶۵ سال سے ۸۴ سال کی عمر کے افراد چار سو ملین سے بڑھ کر ۱۶۴۳ بلین ہو جائیں گے (یعنی ۶۵ سال سے ۸۴ سال کے افراد کی تعداد میں تین گنا اضافہ ہوگا) اس کے مقابلہ میں ۸۴ سال سے زائد عمر کے افراد چھبیس ملین سے بڑھ کر ایک سو چھتر ملین ہو جائیں گے (یعنی ان کی تعداد میں چھ گنا اضافہ ہوگا)۔ اسی طرح سو سال سے زائد عمر کے افراد اسی عرصہ میں ایک لاکھ پینتیس ہزار سے بڑھ کر ۲.۲ ملین ہو جائیں گے (یعنی سو سال سے زائد عمر کے افراد میں اضافہ سولہ گنا ہوگا)۔

بچے کی پیدائش قربانی کا تقاضہ کرتی ہے:

☆ ایک طرف تو مغربی ممالک میں بوڑھوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے تو دوسری طرف حال یہ ہے کہ نئے بچے پیدا ہونے بند ہوگئے ہیں اس کے نتیجہ میں مغربی معاشروں میں نوجوانوں کا تناسب انتہائی کم ہوتا جا رہا ہے۔ اگلی صدی کے اختتام تک مغربی ممالک میں زیادہ تر افراد وہ ہوں گے جن کی عمریں ۸۴ سال اور سو سال سے زائد ہوں گی۔

☆ مغربی ممالک میں نئے بچے پیدا نہ ہونے کی وجہ مغربی اقدار کا فروغ ہے۔ مغربی تہذیب آزادی مساوات

کا پرچار کرتی ہے اس دنیا میں عیش وعشرت کے حصول کا درس دیتی ہے اس کے نتیجہ میں عورت ماں بننے سے انکار کردیتی ہے ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی پیدائش کے نتیجے میں اس کی آزادی پر قدغن لگتی ہے، اس کی عیش وعشرت محدود ہوتی ہے ۔بچے کی پیدائش قربانی کا تقاضا کرتا ہے جبکہ مغربی تہذیب انسان کو قربانی کے لیے نااہل بنادیتی ہے ۔مغربی عورت دردِ زہ برداشت کرنے پر تیار نہیں جواسے گوارا کرتے ہیں ان کی آمدنی اتنی کم ہے کہ بچے کے اخراجات پورے نہیں ہوتے ۔لڑکیاں اور لڑکے نکاح کے بجائے ناجائز تعلقات سے جنسی لذت حاصل کرنا پسند کرتے ہیں ۔طلاق کی صورت میں مرد لٹ جاتا ہے لہٰذا وہ شادی نہیں کرتا ۔ Domestic Violence Act کے تحت عورت شوہر کی شکایت کردے تو اسے گھر سے بے دخل کردیا جاتا ہے ۔

☆ مغربی تہذیب کے فروغ کے نتیجہ میں عورت گھروں سے نکل آئی ۔عورتیں نوکری کرنے لگیں ۔مستقبل کی جستجو میں عورت مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے لگی ۔گھر کو قید خانہ قرار دے دیا گیا ۔اس کے نتیجہ میں یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ عورت اتنے بچے پیدا کرسکے جتنے بچے وہ تاریخی طور پر پیدا کرتی رہی ہے ۔لطف کی بات یہ ہے کہ گھروں میں چوبیس گھنٹے کام کرنے والی عورتوں کو مغرب میں ناکارہ اور باہر کام کرنے والی کو ورکنگ وومن کہا جاتا ہے ۔پیسہ خدا ہے جو عورت پیسہ نہیں کماتی وہ کام نہیں کرتی کام کا نتیجہ پیسہ ہونا چاہیے ۔

☆ تاریخی طور پر اور روایتی معاشروں میں ایک عورت اپنی حیات میں اوسطاً چھ بچے پیدا کرتی تھی ۔آج مغربی ممالک میں ایک عورت اوسطاً ۱٫۶ بچے پیدا کرتی ہے اور آئندہ برسوں میں اور کمی کا امکان ہے ۔

☆ اگر ایک عورت اوسطاً ۱٫۶ بچے پیدا کرتی ہے تو آبادی میں اضافہ صفر ہوگا ۔یعنی آبادی میں جتنا اضافہ ہوگا اموات کی تعداد بھی اتنی ہی ہوگی ۔اگر کسی معاشرے میں عورت اوسطاً ۲٫۱ سے کم بچے پیدا کرتی ہے تو آبادی میں اضافہ منفی ہوگا (یعنی مجموعی آبادی فی الواقع گھٹ رہی ہوگی)اگر یہ اوسط ۲٫۱ سے زیادہ ہوگی تو آبادی میں مجموعی طور پر اضافہ ہورہا

☆ مغرب میں اوسطاً ایک عورت ۱٫۶ بچے پیدا کررہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجموعی طور پر مغرب کی آبادی ہر سال گھٹ رہی ہے ۔۱۹۵۰ء میں دنیا کے بڑے گنجان آباد ممالک میں سے ۷ کا تعلق مغربی ممالک سے تھا ۔اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۵۰ء تک صرف امریکہ اس فہرست میں باقی رہ پائے گا ۔اس کی وجہ گوری نسل میں اضافہ نہیں بلکہ دنیا بھر سے امریکا کی جانب لوگوں کی نقل مکانی کا رجحان ۔

مغرب کی نگہبان: گوری نسل:

☆ اس تمام عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی نگہبان گوری نسل ہی ختم ہورہی ہے ۔ورلڈ بینک ۱۹۹۴ء کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا کی مجموعی آبادی ۵٫۶ بلین ہے ۔مغربی ممالک کی مجموعی آبادی ۱۹۹۴ء میں ۸۴ کروڑ تھی

یعنی عالمی آبادی کا ۱۵فیصد (اگر جاپان کے ۱۳٫۵ کروڑ افراد بھی مغرب میں شامل کر لیے جائیں تو یہ اوسط ۱۷فی صد ہو جاتا ہے۔اور اگر روس کے ۱۴ کروڑ منہا کر دیے جائیں تو یہ اوسط گھٹ کر ۱۴٫۵ فی صد رہ جاتی ہے) اگر مغرب میں رہنے والی غیر گوری آبادی کو مغرب کی مجموعی آبادی کا ۵ فی صد بھی مان لیا جائے تو یہ تناسب ۱۴فی صد رہ جاتا ہے۔

بنیادی حقوق کا فلسفہ: زبانوں اور نسلوں کے لیے

بنیادی حقوق کا فلسفہ اور اس کی تاریخ سے گہری واقفیت کے بغیر ہم ان اسرار اور رموز کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے جن کا تعلق نسلوں اور زبانوں کے قتل عام سے ہے۔سترہویں صدی میں مغربی فلسفے کے نتیجے میں ''خلق جدید'' New Man کا ظہور ہوا۔یہ نیا آدمی اپنے آپ کو مکمل آدمی کہتا تھا اور اپنے سے پہلے دور کے آدمی کو ادھورا آدمی سمجھتا تھا کیونکہ وہ آدمی عہد ظلمات [Dark Ages] کا آدمی تھا۔یہ روشن خیال لبرل آدمی آزادی اور جمہوریت پر ایمان رکھتا تھا۔آزادی کا مطلب سرمایہ کی آزادی، خواہشات کی آزادی اور عام اخلاقی معاشرتی، مذہبی، خاندانی روایتی نسلی تاریخی اصولوں سے آزادی کا ہمہ گیر منصوبہ تھا۔وہ خیر و شر کے لیے کسی خارجی ذریعے کا محتاج نہ تھا اور اپنے ضمیر وجدان اور عقل کو ہی خیر و شر کا خالق و مالک تصور کرتا تھا۔اس خلق جدید کی تعمیر و تشکیل میں بنیادی حقوق کے منشور کا کلیدی کردار ہے۔اس عالمی منشور نے عالمگیر سطح پر نہ صرف فطرت انسانی کو مسخ کر دیا بلکہ حقوق انسانی نے کتاب اللہ، روایات، اخلاقیات کی جگہ بھی لے لی۔اس منشور نے انسان کو ایک ایسی ہستی تصور کیا جو دنیا میں مکمل طور پر آزاد ہے اور کسی پابندی کا خوگر نہیں، خواہشات نفس کی کوئی ترتیب اس کا مسئلہ ہی نہیں۔

حقوق انسانی کے منشور ہ کا اصل سرچشمہ فیڈرلسٹ پیپر امریکی دستور اور امریکی بل آف رائٹ ہے، فیڈرلسٹ پیپر ایک دانشور اقلیت نے خود تحریر کیے اور اسے عالمی اقدار کا منشور قرار دے کر امریکی دستور اور پھر اقوام متحدہ کے منشور حقوق انسانی میں سمو دیا گیا۔

فیڈرلسٹ پیپرز کے مصنفین:

فیڈرلسٹ پیپر جو حقوق انسانی کا منبع ہیں امریکا کے پہلے وزیر خزانہ الیگزینڈر ہملٹن، امریکا کے تیسرے صدر جیمس میڈیسن، امریکا کے پہلے چیف جسٹس جان جے نے تحریر کیے تھے۔یہ پیپرز دستور کی حمایت میں لکھے گئے تھے اور امریکی اخبارات خصوصاً نیویارک ٹائمز میں شائع ہوئے تھے۔

حقوق انسانی کا منشور کس نے لکھا:

حقوق انسانی کا منشور جو امریکی دستور کا چربہ ہے اور جس کی بنیاد فیڈرلسٹ پیپرز پر ہے۔اس منشور

حقوق انسانی کی مصنفہ اس وقت کے امریکی صدر کی بیوی ایلیا روزویلٹ تھی۔ حقوق انسانی کے منشور کو دنیا پر مسلط کرنے کے لیے اقوام متحدہ تشکیل دی گئی ان اداروں کو بنانے والے ممالک وہ عالمی طاقتیں تھیں جو دنیا میں ظلم وجبر اور بربریت کی ذمہ دار تھیں۔ لیگ آف نیشنز کا خیال بھی سب سے پہلے امریکا کو آیا بعض محققین کے مطابق اس کی وجہ یہودیوں کا بڑے پیمانے پر قتل عام تھا لہٰذا اس قتل عام نے امریکا کو متوجہ کیا کہ انسانوں کو اس طرح تہہ تیغ نہیں کرنا چاہیے انسانوں کے کچھ حقوق بھی ہوتے ہیں۔

۸۰ لاکھ ریڈ انڈین کے قتل عام پر حقوق انسانی کہاں تھے؟

یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ جب امریکا کے اصل باشندے قتل کیے جارہے تھے تب کسی کو حقوق کا خیال نہیں آیا۔ اسی لاکھ انسانوں کے بے دریغ اور ظالمانہ قتل عام پر نہ لیگ آف نیشنز بنائی گئی نہ یو این او آخر اس سفاکی اور درندگی پر اقوام عالم کی مشترکہ خاموشی محض غفلت تھی یا مجرمانہ سفاکی یہ کوئی راز نہیں ہے۔

لیگ آف نیشنز، یو این او

لیگ آف نیشنز اور یو این او کیوں بنائی گئی۔ اس کی تفصیلات نہایت ہوش ربا ہیں، لیکن فی الحال تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ امریکی صدر ولسن نے قیام امن کے لیے کوششیں شروع کیں اور ۱۹۱۹ء میں نوبل انعام بھی حاصل کیا لیکن امریکا نے اس انجمن کی رکنیت اختیار نہیں کی۔ اقوام متحدہ کے قیام میں بھی امریکا کا کلیدی کردار ہے۔ اس کے ذریعے امریکا نے امریکی دستور کی روح کو منشور حقوق انسانی کے ذریعے پوری دنیا پر نافذ کرنے میں کامیابی حاصل کی پوری دنیا کو سرمایہ دارانہ نظام کی گرفت میں لینے کی کامیاب ترین کوشش کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ چین اور روس جیسے نظریاتی ممالک بھی [جو اصلاً سرمایہ داری کی ہی شکل تھے] وہ بھی اس انجمن میں شامل ہوگئے اس ادارے کے بارے میں چند حقائق درج ذیل ہیں:

Horrified by the devastation of the war, countries were inspired to come together and work toward peace. They formed a new organization, the League of Nations, to achieve that goal. The League would last from 1920 to 1946 and have a total of 63 member nations through its history, including some of the world's greatest powers: France, the United Kingdom, Italy, Japan, Germany, and the Union of Soviet Socialist Republics. But the League had two major flaws. First, several of the world's most powerful countries were not members, most

notably, the United States. Second, League members proved unwilling to oppose aggression by Japan, Italy, and Germany in the 1930s. This aggression ultimately led to World War II (1939-1945). In the end, the League failed in its most basic mission, to prevent another world war.

Despite this failure, the idea of a league did not die. The first commitment to create a new organization came in 1941, when U.S. president Franklin D. Roosevelt and British prime minister Winston Churchill signed the Atlantic Charter, in which they pledged to work toward a more effective system to keep world peace and promote cooperation. In 1942 representatives of the Allies-the World War II coalition of 26 nations fighting against Germany and Japan-signed a Declaration by United Nations accepting the principles of the Atlantic Charter. The declaration included the first formal use of the term United Nations, a name coined by President Roosevelt. A year later, four of the Allies-the United States, the United Kingdom, the Soviet Union, and China-agreed to establish a general international organization. The four countries met in 1944 at the Dumbarton Oaks estate in Washington, D.C., and drafted a charter for the new organization. They called the new league the United Nations. But they still could not agree to certain details, such as membership and voting rights.

[Microsoft Encarta Encyclopedia 2004, United Nations\Creation of The United Nations]

Wilson's belief in international cooperation through an association of nations led to the creation of the League of Nations and ultimately to the United Nations. For his efforts in this direction, he was awarded the 1919 Nobel Prize for peace. More than any president before him, Wilson was responsible for increasing United States participation in

world affairs

Reference: Microsoft Encarta Encyclopedia 2004

Wilson (Thomas) Woodrow\Introduction

The UN recognized it would not be successful unless it had the ongoing support of the world's most powerful countries. The organization took several steps to ensure that support. To encourage continued U.S. involvement, the UN placed its headquarters in New York City. To reassure the world's most powerful countries that it would not threaten their sovereignty, the UN gave them veto authority over its most important actions. Five countries received this veto power: the United States, Britain, France, the Soviet Union, and China. (Russia inherited the Soviet Union's veto after the breakup of that country in 1991.)

Origin of the UN:

The concept of a union of all nations for preservation of the peace was at least as old as the League of Nations, which had failed primarily to prevent WWII because it lacked the membership of the US. After the US entered WWII in Dec. 1941, president Roosevelt initiated a series of international conferences with the aim of establishing a new league of which the US would be a leading member. [The Encyclopedia AMERICANA 1929-1953 Volume 27, pg.304]

حقوق انسانی کے منشور کے اثرات:

اس منشور نے انسانی مساوات کا تصور دیا جس کے ذریعے مذہبی اور روحانی معاشروں میں حفظ مراتب کی تہذیب تباہ ہوگئی۔ ماں اور بیٹا، استاد اور شاگرد، پیغمبر اور امتی، بزرگ اور بچے، پیر اور مرید بڑا اور چھوٹا نیک و بد فرشتہ و شیطان جاہل و عالم، احمق و عقل مند سب برابر ٹھہرے حالانکہ کسی بھی معاشرے میں عملاً یہ ممکن نہیں ہے۔ آزادی کے تصور نے یہ پیغام دیا کہ ہر انسان برابر، آزاد اور عاقل ہے اور علم کا اصل ذریعہ عقل ہے اسی عقل کے ذریعے انسان خیر کی شناخت کرتا ہے، وہ کسی کو جواب دہ نہیں ہوتا، وہ خیر کو تبدیل بھی کرسکتا ہے، وہ اپنے تصور

خیر کی تبدیلی کے لیے کسی کا محتاج نہیں، کسی سے اجازت لینے کا پابند نہیں، کسی کو جواب دہ نہیں وہ اپنا نفس کسی کے سامنے پیش کرنے اور ہدایت لینے کا محتاج نہیں، کسی بھی فرد کی قلبی کیفیت کا اس کی ذات سے کوئی تعلق نہیں، حق وہ ہے جسے جھوٹ ثابت کیا جا سکے جو چیز جھوٹ ثابت نہ ہو سکے وہ حق کہلانے کی مستحق نہیں، یہی سائنٹفک معتقد ہے، اسی کے ذریعے سائنس کا ارتقاء ہوا ہے، آج جو سچ ہے کل جھوٹ ہو جائے گا، مسترد کر دیا جائے گا لہٰذا اصلاً کوئی چیز حق و خیر نہیں ہے یہ تو تجربات کی آماج گاہ ہے تجربے سے جو چیز ثابت ہو جائے وہی درست ہے۔ تجربیت Emperical Orientation ہی سائنسی طریقہ ہے۔ اس طریقے سے جو چیز ثابت نہ ہو سکے وہ غلط ہے۔ اس طرز فکر کے نتیجے میں وحی کتاب اللہ پر شک کرنا لازمی ہے۔ اگر کائنات میں کوئی ایسا فکر، کتاب، نظریہ، عقیدہ ہے جس پر شک نہیں کیا جا سکتا، جسے رد نہیں کیا جا سکتا تو اصلاً وہ غیر سائنسی فکر نظریہ ہے جسے رد کر دینا چاہیے، مسلم جدیدیت پسند بھی یہی خیال پیش کرتے ہیں، حق وہی ہے جسے غلط ثابت کیا جا سکے۔ ہر زمانے میں حق کی تعریف و تعبیر حالات و زمانہ کی رعایت سے بدلتی رہتی ہے لہٰذا کوئی اسلامی تعبیر مستقل نہیں ہو سکتی، ہماری علمیت میں اضافے کے ساتھ ساتھ تعریف بدلتی جائے گی یہی اجتہاد ہے جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھے گا اسلام کی تعبیر بدلتی جائے گی، یہی حرکت دین کی روح اور زندگی ہے اسی نقطہ نظر کے نتیجے میں مغربی معاشروں میں دینیات، اسلامیات مذاہب اخلاقیات، آداب، تہذیب، حفظ مراتب ختم ہو گئے۔

بنیادی حقوق کے فلسفے نے انسان کو خاندان کا اجتماعیتوں کو گروہوں، نسلوں، قبیلوں کو تہس نہس کر کے ہر انسان کو تنہا کر دیا۔ انسان تمام اجتماعیتوں سے آزاد ہو گیا لیکن اس آزادی نے اسے پاگل کر دیا دنیا میں سب سے زیادہ نفسیاتی مریض مغرب میں ہیں۔ ناروے، سوئٹزر لینڈ، جرمنی دنیا کے امیر ترین ممالک ہیں مگر سب سے زیادہ خودکشیوں کی شرح ان تینوں ممالک میں ہے۔ جب آزادی مساوات خوشحالی، دولت سب کچھ مل گیا تو اب خودکشی کی وجہ کیا ہے؟ مغربی تہذیب جو پہلے دنیا پر حملہ آور تھی اب خود اپنے آپ پر حملہ آور ہے۔ پہلے اس تہذیب نے اجتماعیتوں کو تحلیل کر کے انسان کو تنہا کر کے انھیں مادر پدر آزاد کیا۔ جب یہ آزادی مشکل ہو گئی تو خودکشی کا راستہ دکھایا گیا۔ مغرب کے بہت سے اہم دانشور اور فلسفی خودکشی کر چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اجتماعیتوں کے خاتمے کے نتیجے میں زبانوں اور نسلوں کے لیے شدید خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔ انسان نہ قربانی کا تصور کر سکتا ہے نہ کسی کے لیے ایثار کر سکتا ہے۔ اجتماعی نظم و ضبط خاندان قبیلے گروہ انسان کو ایک حوصلہ، طاقت اور ولولہ عطا کرتے ہیں۔ مغربی تہذیب نے انسانوں کو آزاد کر کے اجتماعیتوں کا خاتمہ کر کے انسان کو حاسد و حریص بے حس و مریض بنا دیا ہے تعیشات زندگی کے نتیجے میں اخراجات زندگی بڑھ گئے ہیں۔ اپنی ذات ہی سب کچھ ہو گئی ہے خواہشات نفس ہی الہ بن گیا ہے۔ اس آئینہ خانے میں اپنے ہی نفس کی پرستش ہو رہی ہے تو فطری اجتماعیت کیسے

وجود پذیر ہو۔ فطری اجتماعیت کا پہلا ادارہ خاندان ہے اور خاندان کی بنیاد نکاح ہے اور نسل کا سلسلہ اولاد سے قائم ہے۔ مغربی تہذیب نے ان بنیادی اداروں کا خاتمہ کر دیا ہے جن علاقوں میں اجتماعیتیں باقی ہیں وہاں مغربی تہذیب کی چکا چوند اور اعلیٰ معیار زندگی کی تلاش کے باعث اخراجات زندگی بڑھ گئے ہیں لہٰذا نقل مکانی ہو رہی ہے۔ آبادیاں ویرانوں میں بدل رہی ہیں، نقل مکانی زبانوں اور نسلوں کے لیے سنگین خطرات کا اعلان کر رہی ہے، اس لیے دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ صرف تین سو سال کے اندر ہزاروں زبانیں مغربی تہذیب کے ہاتھوں مٹ گئیں، مٹا دی گئیں اور یہ سلسلہ تیزی سے جاری و ساری ہے لہٰذا زبانوں کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ بنیادی حقوق کے فلسفے کو اچھی طرح سمجھا جائے اور اس کے خطرات کا تدارک کیا جائے۔ اس کی مزید تفصیلات جریدہ کے شمارہ ۲۹ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

نوے فی صد بچے غیر مغربی ممالک پیدا کر رہے ہیں:

☆ آبادی کے اضافے کی رفتار مغربی ممالک میں دیگر ممالک سے نمایاں طور پر کم ہے اور اب ۹۰ فی صد سے زیادہ بچے غیر مغربی ممالک میں پیدا ہوتے ہیں۔ ماہرین اعداد و شمار اس بات پر متفق ہیں کہ ۲۰۵۱ء تک گوری نسل دنیا کی آبادی کا محض آٹھ فی صد رہ جائے گی۔ ۲۱۰۰ء تک مغربی ممالک میں گوری نسل تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔

مغرب کے جواں، تازہ دم دشمن:

☆ ایک طرف تو مغرب میں بوڑھے افراد کی تعداد میں ہوش ربا اضافہ ہو رہا ہے اور اس کے ہاں نئے بچے پیدا نہیں ہو رہے ہیں اور اس کے معاشروں میں جوانوں کی تعداد میں روز بروز کمی ہو رہی ہے تو دوسری طرف غیر مغربی معاشروں میں اور خاص طور پر وہ ممالک جو مغرب کے لیے خطرہ ہیں اس کے برعکس صورت حال پیش کر رہے ہیں۔

☆ وہ ممالک جہاں آبادی کم ہو رہی ہے جوانوں کی تعداد میں کمی آ رہی ہے اور بوڑھوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، ایسے ممالک عموماً مغرب کے دوست ہیں۔ اس کے برعکس وہ ممالک جہاں آبادی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے جہاں جوانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور جہاں بوڑھوں کی تعداد کم ہے، یہ وہ ممالک ہیں جو مغرب کے کٹر دشمن ہیں۔

☆ غزہ کی پٹی کو دیکھ لیں جہاں ہر عورت اوسطاً ۳ء۷ بچے پیدا کرتی ہے اس کے برعکس اسرائیل میں ہر عورت اوسطاً محض ۷ء۱ بچے پیدا کرتی ہے۔

☆ اسی طرح آبادی میں اضافے کی شرح کے بلند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جوانوں کی تعداد ان ممالک میں بہت زیادہ ہے۔ یوگینڈا کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں ۱۵ سال سے کم عمر افراد آباد کا تقریباً نصف

ہیں۔ پاکستان میں یہ تعداد ۴۸ فی صد ہے۔

☆ یہ وہ ممالک ہیں جن میں آبادی میں اضافہ بڑی تیزی کے ساتھ ہورہا ہے۔ ایران کی ان مثال کو اگر لیں تو ہر پچیس سال بعد ایران کی آبادی دگنی ہوجاتی ہے۔

☆ پینٹاگون کے پالیسی سازوں نے اگلی صدی میں مغرب کے لیے امکانی خطروں کے جن گڑھوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اسی قسم کے علاقے ہیں۔ ان علاقوں کی خصوصیات یہ ہیں کہ یہ گنجان آباد ہیں، نوجوانوں کا تناسب آبادی میں بہت زیادہ ہے اور آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ مغرب کے لیے آئندہ صدی میں خطرات گنجان آباد اور نوجوانوں سے بھرے اور تیزی سے پھیلتے شہروں سے نمودار ہوں گے۔

مغرب کے دشمن: مغرب کے قلب میں

☆ مغرب میں بوڑھوں کی تعداد میں اضافہ کا مطلب یہ ہے کہ کام کرنے کے قابل افراد کا تناسب معاشرے میں گھٹ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب اس بات پر مجبور ہے کہ کارکنان اور مزدوروں کو درآمد کرے۔ جوں جوں مغربی آبادی میں مذکورہ بالا تبدیلیاں گہری ہوتی جائیں گی ویسے ویسے مغربی ممالک کارکنوں اور مزدوروں کو بڑی تعداد میں درآمد کرنے پر مجبور ہوں گے۔

☆ مغربی ممالک میں درآمد کیے جانے والے یہ کارکن اور مزدور اپنے ساتھ غیر مغربی روایتیں اور اقدار بھی لے کر آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں موجود غیر مغربی مہاجرین کے ہاں شرح پیدائش بہت زیادہ ہوتی ہے۔

☆ اس کے نتیجہ میں آہستہ آہستہ یہ ہورہا ہے کہ مغرب کی آبادی میں غیر مغربی لوگوں کا تناسب بڑھ رہا ہے اور چوں کہ مغرب کی آبادی میں تو مسلسل کمی ہورہی ہے اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ اس تناسب میں مزید اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

☆ آج مغربی ممالک میں غیر مغربی افراد آبادی کا دس فی صد ہیں۔ اس تعداد میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے۔ صرف جرمنی میں ۲۰۳۰ء تک غیر ملکی کارکن اور مزدور مقامی یورپی آبادی کا تیس فی صد ہوجائیں گے۔ فرانکفرٹ اور میونخ جیسے اہم شہروں میں غیر مغربی افراد کی تعداد آبادی کے نصف تک پہنچ جائے گی۔

☆ آج مغربی ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۱۰ سے ۱۳ ملین ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ آج مغرب میں اسلام اور مسلمان ایک زندہ اور موجودہ قوت ہے۔ اس موجودگی نے ان تاریخی امکانات کو جو مغربی تہذیب کے زوال کے ساتھ منسلک ہیں ایک نئی جہت عطا کی ہے۔

مغرب کا معاشی زوال:

جوان آبادی میں تیزی سے کمی اور بوڑھی آبادی میں تیزی سے اضافے نے مغرب کے معاشی زوال کو تیز

تر کردیا ہے۔اس کے نتیجے میں نسلیں اور زبانیں مٹ رہی ہیں۔

☆ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق آئندہ تیس سالوں کے دوران مغربی حکومتوں کو اپنے بوڑھوں کی پنشن ادا کرنے کے لیے اپنی موجودہ مجموعی قومی پیداوار کی نو سے سو فیصد زائد رقم درکار ہوگی۔مغرب میں آج کام کرنے والے کارکن اور مزدور جس پنشن کے پہلے سے اہل ہو چکے ہیں اور اس کے لیے کسی قسم کی کوئی بچت موجود نہیں ہے وہ ۳۵ ٹریلین ڈالر ہے۔اگر اس میں بوڑھے افراد کی صحت کی مد میں درکار رقم کو شامل کرلیا جائے تو کل رقم ۶۴ ٹریلین بن جاتی ہے۔(ایک ٹریلین ہزار بلین کے برابر ہے)۔

☆ کسی امیر سے امیر ملک کے بس میں بھی نہیں ہے کہ اس معاشی بوجھ کو سہار سکے۔اگر اس رقم کو مزید ٹیکس لگا کر پورا کرنے کی کوشش کی جائے تو ٹیکس کی شرح میں ۲۵ سے ۴۰ فی صد تک اضافہ کرنا پڑے گا۔یہ ناممکن ہے کیوں کہ بہت سے ایسے ممالک ہیں جس میں ٹیکس پہلے ہی ۴۰ فی صد ہے۔

جاپان۔بوڑھی آبادی اور معیشت:

☆ نتیجہ یہ ہوگا کہ مغربی حکومتوں کا خسارہ اس حد تک بڑھ جائے گا کہ وہ تمام قومی بچتوں کو نگل جائے گا۔

☆ عالمی سرمایہ داری پر اس بحران کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے جاپان کی مثالیں لیجیے۔جاپان کا فالتو سرمایہ اس وقت تمام ترقی یافتہ ممالک کے فالتو سرمایہ کے نصف سے زیادہ ہے۔اس سرمایہ کو جاپان دوسرے ممالک کو برآمد کرتا ہے۔اس کے نتیجہ میں سرمایہ کاری ہوتی ہے اور سرمایہ کی گردش ایک خاص نہج کے مطابق جاری و ساری رہتی ہے۔۲۰۳۰ء تک یہ سب کچھ بدل چکا ہوگا۔اس وقت تک جاپان اپنی بڑھتی ہوئی بوڑھی آبادی پر یہ سارا فاضل سرمایہ خرچ کرچکا ہوگا اس کے نتیجہ میں جاپان سرمایہ کو برآمد کرنا تو درکنار درآمد کرنے کا محتاج ہوگا۔اس کے نتیجہ میں دنیا بھر میں سرمایہ کی گردش،تبادلہ کی شرح اور شرح سود پر اس قدر منفی اثر پڑے گا کہ سرمایہ داری کی بلند و بالا عمارتیں زمین بوس ہو چکی ہوں گی۔

سو سال کے بوڑھے:آبادی بڑھ رہی ہے:

☆ جیسا کہ ہم اوپر عرض کرچکے ہیں مغرب میں جو جس قدر زیادہ بوڑھا ہے اس کی نسل اس قدر تیزی سے بڑھ رہی ہے۔سو سال کے بوڑھے ۸۰ سال کے بوڑھوں کے مقابلہ میں تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں۔معاشی اعتبار سے جو جتنا بوڑھا ہے وہ اسی قدر زیادہ مہنگا پڑتا ہے۔مثلاً بوڑھوں کے دیکھ بھال کے لیے بنائے گئے گھروں یعنی نرسنگ ہوم کے اخراجات ہی کی مثال لے لیں تو بہت ہی بوڑھوں (یعنی ۸۵ اور سو سال کے بوڑھوں) اور کم بوڑھوں (یعنی ۶۵ سال کے لگ بھگ اور ۸۵ سال سے کم عمر) کے افراد کے اخراجات کا تناسب ۲۰ اور ایک ہے۔ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جوں جوں بڑے بوڑھوں کی تعداد میں مزید اضافہ

ہوتا چلا جائے گا مغرب کا معاشی بحران مزید گہرا ہوتا چلا جائے گا۔

☆ بوڑھوں کی آبادی میں مسلسل اضافہ اور اس کے ساتھ ساتھ آبادی میں کمی کے نتیجہ میں مغربی ممالک میں نوجوانوں کی تعداد میں مسلسل کمی ہو رہی ہے۔اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ معاشی کارندوں اور مزدوروں کی تعداد میں مسلسل کمی ہو رہی ہے۔صرف جاپان میں ۲۰۰۰ء اور ۲۰۱۰ء کے درمیان تیس سال کی عمر تک کے مزدوروں میں ۲۵ فی صد کمی واقع ہوگی۔

☆ نوجوانوں کی تعداد میں کمی اور بوڑھوں کی تعداد میں اضافہ کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ کھانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور کمانے والوں کی تعداد میں مسلسل کمی ہو رہی ہے۔آج مغرب میں کمانے والوں اور کھانے والوں کا تناسب تین اور ایک ہے۔۲۰۲۰ء تک یہ تناسب ۱.۵ اور ایک رہ جائے گا،حتیٰ کہ کچھ ممالک مثلاً جرمنی میں یہ تناسب ایک اور ایک رہ جائے گا۔

☆ اس کا مطلب یہ ہے کہ کارکن جو کچھ بچائے گا وہ بوڑھے کھا جائیں گے۔اس کے نتیجہ میں سرمایہ کاری کے لیے پیسہ نہیں بچے گا۔نہ ہی دوسرے ملکوں کو امداد دینے کے لیے مغرب کے پاس پیسہ رہے گا۔ان دونوں عوامل کے نتیجہ میں مغرب کا معاشی استعمار اپنی موت آپ مر جائے گا۔اسی لیے یہ مطالبہ بھی مغرب میں ہو رہا ہے کہ جوانوں کے دو ووٹ ہوں تا کہ بوڑھوں کے ووٹ ان کے مفادات کا تحفظ نہ کر سکیں۔

مغرب کا عسکری زوال:

☆ مغربی معاشروں میں نوجوانوں کی گھٹتی ہوئی تعداد کا مطلب یہ ہے کہ مغربی ممالک آہستہ آہستہ اس قابل نہیں رہیں گے کہ بڑی فوجیں رکھ سکیں یا لمبی زمینی جنگیں لڑ سکیں۔اس کے نتیجہ میں مغربی استعمار کی گرفت آہستہ آہستہ کمزور ہوتی چلی جائے گی۔

☆ افراد کی کمی پورا کرنے کا متبادل راستہ ٹیکنالوجی میں مسلسل ترقی اور اسلحہ میں مسلسل اضافہ ہے لیکن مغرب کی مسلسل گرتی ہوئی معاشی طاقت اس بات کو ناممکن بنا دے گی کہ اس مد میں مزید رقوم خرچ کی جا سکیں۔

☆ مغرب کو درپیش خطرات مسلسل بڑھ رہے ہیں۔لیکن ان خطرات سے نبرد آزما ہونے کی طاقت مسلسل کم ہوتی جا رہی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مغرب کا انحصار انتہائی اقدام کے استعمال پر بڑھتا چلا جائے گا۔

☆ یہ انتہائی اقدام دو طرح کے ہوں گے۔نچلی سطح کے انتہائی اقدام میں کروز میزائل وغیرہ پر زیادہ سے زیادہ انحصار جبکہ اونچی سطح کے انتہائی اقدام میں ایٹمی قوت کا استعمال شامل ہے۔

☆ مغربی ممالک تہذیبی طور پر غالب قوت تھے تو وہ

ا) آبادی کے لحاظ سے دنیا کے سب سے تیزی سے بڑھنے والے ممالک میں شامل تھے۔

ب) ان کے پاس اضافی سرمایہ تھا جس کے ساتھ وہ سرمایہ کاری کر کے اپنی قوت اور دولت میں اضافہ کر سکتے تھے۔

ج) مغربی ریاستیں مضبوط ریاستیں تھیں جو اس قابل تھیں کہ دنیا بھر میں اپنی قوت و طاقت اور اپنی اقدار اور روایات کا ڈنکا بجا سکیں۔

☆ آج جب مغرب زوال پزیر ہے تو صورتحال برعکس ہے۔

ا) مغربی ممالک میں آبادی میں اضافہ تو کجا ان کی آبادی مسلسل گھٹ رہی ہے۔

ب) مغربی ممالک کے پاس اضافی سرمایہ نہیں رہا جس کے بل پر وہ سرمایہ کاری کر سکیں۔

ج) آج مغرب کی قوت مسلسل گھٹ رہی ہے اور اپنی اقدار کو پھیلانا تو درکنار وہ ان کا جواز بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مغربی ریاست کی قوت مسلسل سکڑ رہی ہے اور گھر میں بھی مسلسل سکڑ رہی ہے۔

☆ مغرب زوال کے یہ تینوں نسخے مسلمان ممالک پر آزما رہا ہے۔

ا) وہ چاہتا ہے کہ مسلمان ممالک میں آبادی میں اضافہ نہ ہو تا کہ وہ اس کے لیے خطرہ نہ بن سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مسلم ممالک میں فیملی پلاننگ اور تحدید آبادی کے پروگرام بڑے زور و شور سے چلائے جا رہے ہیں۔

آبادی میں اضافہ: زبانوں کا تحفظ:

☆ آج اکیسویں صدی کے آغاز پر مغرب کا زوال ایک ایسی حقیقت ہے جس کی گواہی خود مغرب کے مفکرین اور اس کے منصوبہ ساز دے رہے ہیں۔ اس زوال کی بنیاد وہ آبادیاتی شماریات ہیں جو مغربی معاشروں کی مستقبل کی تصویر ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اس زوال کو روکنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ مغرب میں آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہو۔ خود مغربی مفکرین کے نزدیک یہ ناممکن ہے۔ اس کی وجہ مغرب کی تہذیبی اقدار ہیں جنہوں نے فرد کو اتنا خود غرض بنا دیا ہے کہ وہ خاندان بنانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مغرب کے زوال کو روکنے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ "مغربیت" سے دستکش ہو جائے۔ وہ خدا بیزاری کو چھوڑ دے۔ دوسرے معنوں میں مغرب اپنی خدا بے زار تہذیب کی جھلسا دینے والی آگ کو چھوڑ کر اسلام کے شجر سایہ دار کے نیچے آ جائیں۔ یہی ایک صورت ہے جس کے نتیجہ میں مغرب بچ سکتا ہے ورنہ یقینی طور پر اس صدی کے اختتام تک مغرب میں گوری نسل ختم ہو جائے گی۔ نسلوں میں اضافے کے ذریعے ہی زبانوں کو تحفظ دیا جا سکتا ہے لیکن مغرب میں آبادی میں اضافے کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ لہٰذا مغرب دنیا بھر میں خاندانی منصوبہ بندی کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ تا کہ اس کی تہذیب کے دشمنوں یا اس کے وسائل پر بوجھ بننے والوں کی تعداد میں کمی آئے اور افرادی قوت اس کے لیے مسئلہ

نہ بن سکے۔

زبانوں کی حفاظت کے تین فطری طریقے:

یہ بات درست ہے کہ نقلِ مکانی جہاں رزق کے بہت سے وسیلے پیدا کرتی ہے وہیں اپنی مادری زبان سے عشق کی شمع کو بجھا دیتی ہے۔ غربت میں یادِ وطن آتی ہے لیکن وہ ماحول اور وہ لوگ نہیں ملتے جن میں گھل مل کر زبان کا جوبن اپنی بہار دکھا سکتا ہو۔ ماہرین کے مطابق زبانوں کی حفاظت دو وجوہات کے باعث ممکن ہے یا تو اس زبان میں عظیم الشان علمی ورثہ ہو جیسے لاطینی یا ہسپانوی زبانیں جن سے آج تک استفادہ کیا جا رہا ہے یا زبان رزق کے حصول کا ذریعہ ہو۔ یہ دونوں تاریخی نظریات اپنی جگہ لیکن زبان کا ایک تعلق مادری زبان سے عشق سے بھی ہے۔ اس عشق کو ماں کی گود میں دی جانے والی لوری اور دادی اور نانی کی زبان سے لفظوں کی برکھا میں بھیگی ہوئی دل چسپ قدیم کہانیاں زندہ و پائندہ رکھتی ہیں۔ ماں اپنے بچے سے جس زبان، اسلوب اور طرز میں گفتگو کرتی ہے وہ بچے کے لیے زندگی کا سب سے خوبصورت، سنہری اور ناقابلِ فراموش عہد ہوتا ہے۔ اس عہد کی یاد بڑھاپے تک قدم بقدم پر اس کے ہم رکاب رہتی ہے۔ لہٰذا تمام مائیں خواہ وہ کوئی زبان بولتی ہوں ان کا فرض ہے کہ وہ اس زبان میں اپنے بچوں کو کہانیاں، لوریاں، گیت، نغمے، لطیفے اور قصے سنانے کا خصوصی اہتمام کریں تا کہ بچے کا ذہن الفاظ کا نادر ذخیرہ بن جائے۔ یہ ذخیرہ کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔

اپنے گھر میں صرف اپنی زبان بولیے:

زبانوں کی حفاظت کا دوسرا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنے گھروں میں اپنی زبان خواہ وہ کوئی بھی ہو صبح و شام بولی جائے، صرف گھر سے باہر رابطے کی زبان استعمال کی جائے۔ بچوں کو اپنی مادری زبان دس سال تک قصے کہانیوں، پہیلیوں، گیتوں اور نصیحتوں میں گھول کر دی جائے تا کہ قطب شمالی کی منجمد سردی میں بیٹھے ہوئے تنہا انسان کے کان ماں کی دی ہوئی لوریوں کے بول سے گونج اٹھیں۔ یہ روشِ سمیت تمام زبانوں کی حفاظت کا یہی طریقہ ہے۔ ہر زبان خواہ وہ کسی قوم، مذہب یا کسی بھی نسلی، ثقافتی گروہ کی ہو تاریخ، علم، تحقیق، ثقافت اور تجربات کا سرمایہ ہوتی ہے۔ اس کی حفاظت اس سے محبت سب کا بنیادی فریضہ ہے۔ ارشادِ رسالت مآبؐ ہے کہ "کسی قوم کے شر سے بچنا چاہتے ہو تو اس کی زبان سیکھ لو"۔ رسالت مآبؐ نے زبان سیکھنے کی ہدایت کی ہے اسے مٹانے اور فنا کرنے، ختم کرنے کا حکم نہیں دیا کیوں کہ آپؐ رحمت للعالمین تھے۔

خاندان میں اضافہ کیجیے:

زبانوں کی حفاظت کا دوسرا اہم فطری طریقہ خاندان کی تعداد میں اضافہ ہے۔ معیارِ زندگی کی دوڑ

ستانوے XCVII

خاندان کو دن بہ دن مختصر کر رہی ہے تعیشات زندگی ذمہ داریوں سے فرار کے بغیر ممکن نہیں، مغربی تہذیب نے لذت کو مقصد زندگی بنا دیا ہے سادہ زندگی عین فطرت ہے۔ تمام مذاہب سادگی کا درس دیتے ہیں۔ سادگی کے بغیر بڑے خاندان کی کفالت ممکن نہیں، عیش و عشرت کی زندگی کے نتیجے میں خاندان مختصر ہوتے جائیں گے اور نسلیں فنا ہوں گی تو زبانیں بھی ختم ہو جائیں گی لہٰذا ترک وطن کے بجائے وطن میں رہنے کو ترجیح دی جائے اور اگر ترک وطن ضروری ہو تو خاندان کو وسیع کیا جائے تاکہ زبان محفوظ رہے۔

حوالہ جات

۱۔ سیدخالد جامعی مرتب جدید شمارہ ۲۱[لسانیات نمبر] اور جدید شمارہ ۲۴[قدیم لسانیات وکتبات نمبرزبانوں کے آغاز اور ارتقاء پر خصوصی اشاعتیں] شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی کا علمی وتحقیقی مجلہ دونوں شماروں میں مولانا ابوالجلال ندویؒ کی لسانی تحقیقات پیش کی گئی ہیں ۔جن میں "ام الس" کے حوالے سے نئے مباحث ہیں۔ندویؒ نے عربی کو ام السنہ قرار دیا ہے اور وادی سندھ کی مہروں کے نقوش عربی زبان کی مدد سے پڑھنے کا دعویٰ کیا ہے۔

۲۔ ایضاً، جدید شمارہ ۲۳[فلسفہ لسان نمبر] اس شمارے میں وادی سندھ کی مہروں کے حوالے سے ام الالسنہ کی نئی بحث کی گئی ہے اور سنسکرت کے بجائے عربی کو ترجیح دی گئی ہے۔

۳۔ ایضاً، جدید شمارہ ۲۴[قدیم لسانیات و ادبیات نمبر] اس شمارے میں زبانوں کے آغاز کے بارے میں مذہبی روایات کا تحقیقی جائزہ، اقوام عرب وعجم کا اسلوب تحریر وفن لغت نویسی، دنیا بھر میں موجود زبانوں کی تقسیم وتفہیم وغیرہ موضوعات اور مولانا ابوالجلال ندوی کا تحفہ نقوش موئن جودڑو شامل ہیں۔

۴۔ ڈاکٹر سہیل بخاری 'اردو کی کہانی' "فضلی سنز لیمیٹڈ کراچی ۱۹۹۴

۵۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل مرتب جدید شمارہ اکیس[لسانیات نمبر] اس شمارے میں خالد حسن قادری کا تحقیقی مضمون "اردو کا آغاز اور مولد" انگریزی سے ترجمہ کر کے شامل کیا گیا ہے جس میں زبانوں کے آغاز اور ام الالسنہ کے حوالے سے نئے گوشے وا کیے گئے ہیں۔

۶۔ سیّد خالد جامعی مرتب جدید شمارہ ۲۹[غیر مطبوعہ کتابیں نمبر] معروضات میں صفحہ ایک پر مرتب نے ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی مدیر شب خون کا خط نقل کیا ہے جس میں سہیل بخاری مرحوم کی تحقیقات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۷۔ ڈاکٹر خالد حسن قادری 'اردو کا آغاز اور مولد" مشمولہ جدید شمارہ ۲۱، ص IX ایضاً

۸۔ ایضاً، ص IX

۹۔ ایضاً، ص X

۱۰۔ ایضاً، ص IX

۱۱۔ ایضاً، ص XIV

۱۲۔ گروپ کیپٹن فیاض محمود تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند[علاقائی ادب] لاہور پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۳ء جلد ۵ ص ۵۶......لاہور

۱۳۔ شہباز سلیم[بروشسکی زبان] مشمولہ جدید ۲۱ ص XXIV

۱۴۔ ایضاً، ص XXIV

۱۵۔ گروپ کیپٹن فیاض محمود تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند[علاقائی ادب] پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۳ء جلد ۵ ص ۵۸،۵۷، لاہور

۱۶۔ ایضاً،ص۷۱،۷۰

۱۷۔ ایضاً،ص۳۳تا۶۱

۱۸۔ ایضاً،ص۶۹ تا۶۵

۱۹۔ جریدہ شمارہ ۲۶ ایضاً،معروضات ص۲

۲۰۔ G. Morgenstiern: Report on a liguistic Mission to North West India 1932 OSLO.

۲۱۔ معروضات ڈاکٹر معین الدین عقیل مشمولہ جریدہ ۲۱، ص V.VI

۲۲۔ سیّد خالد جامعی "زرد و سکی تاریخ و تحقیق کی میزان میں" مشمولہ جریدہ شمارہ ۲۱ XXVIII

۲۳۔ ایضاً، XXVIII - XXIX

۲۴۔ ایضاً، XXIX

۲۵۔ ایضاً، XXX

۲۶۔ ایضاً، XXXI

۲۷۔ XXII, XIII

۲۸۔ Grierson 1915 LSI 801-Intronote

۲۹۔ Colin P. Masica: The new liguisitc Environment p.p. 41-42

۳۰۔ David Crystal: *An Encyclopaedic Dictionary of Language & Languages*, p.52, Hudders Field 1992.

۳۱۔ Anatole V. Lyovin: *An Introduction to the Languages of the World,pp.125-126,* Oxford University Press. New York. Oxford.1997.

۳۲۔ گروپ کیپٹن فیاض محمود مرتب تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند [علاقائی ادب] پنجاب یونیورسٹی، ص ۷۷۔۷۸، لاہور

۳۳۔ ایضاً،ص۸۰

۳۴۔ ایضاً،۸۰۔۸۱

۳۵۔ ایضاً،ص۸۲

۳۶۔ ایضاً،ص۸۲،۸۳

۳۷۔ A.P. ELKIN, The Australian Aborigines [1964]

C سو

۳۸۔ H. SHEILS, Australian Aboriginal Studies [1969]

۳۹۔ R.M. BERNDT. Kinship and Culture [1971]

۴۰۔ S.A. WARUM. Languages of Australia and Tasmania [1972]

۴۱۔ F.M. VOEGELIN, Classification and Index of the World's Languages [1977]

۴۲۔ ALFRED METRAUX "Eastern Island Script" [1957]

۴۳۔ پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد "اسرائیل میں عبرانی زبان کا مقام" مشمولہ "اخبار اردو" جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۲

۴۴۔ ایضاً، ص ۳

۴۵۔ ایضاً

۴۶۔ ایضاً

۴۷۔ ایضاً، ص ۴ ۔ ۵

۴۸۔ ایضاً، ص ۵

۴۹۔ ایضاً، ۶

۵۰۔ ایضاً

۵۱۔ ایضاً، ۵

۵۲۔ ایضاً،

۵۳۔ خالد علی انصاری ماہنامہ ساحل شمارہ دسمبر ۱۹۹۹ء

۵۴۔ ایضاً، جنوری ۲۰۰۰ء

۵۵۔ ایضاً، فروری ۲۰۰۱ء

۵۶۔ ایضاً، نومبر ۱۹۹۹ء

بروشسکی: مزید مطالعات کے لیے حوالہ جات

Anderson, Gregory D.S. 1997. "Burushaski Phonology." Alan S. Kaye & Peter T. Daniels (eds.). Phonologies of Asia and Africa (Including the Caucasus). Winona Lake, IN: Eisenbrauns. 1021-41

Backstron, Peter C. 1992. "Burushaski." Peter C. Backstrom & Carla F. Radloff. Languages of Northern Areas. Islamabad: National Institute of Pakistan Studies and Summer Institute of Linguistics. (Sociolinguistic Survey of Northern Pakistan, 2). 31-54

Barbour, P.L. 1921. "Burucaski, a Language of Northern Kashmir." Journal of American Oriental Society, 41:60-72

Bashir, Elena. 1985. "Towards a Semantics of the Burushaski Verb." Arlene Zide, R.K. David Magier & Eric Schiller (eds.). Proceedings of the Conference on Participant Roles. South Asia and Adjacent Areas. Bloomington: Indiana University Linguistics Club. 1-32

Bashir, Elena. 1996. "Mosaic of Tongues: Quotatives and Complementizers in Northwest Indo-Aryan, Burushaski and Balti." William L. Hanaway & Wilma Heston (eds.). Studies in Pakistani Culture. Lahore: Sang-e-Meel, with Lok Virsa. 187-286

Benveniste, C. 1948. 1949. "Remarques sur la classification nominale en Burusaski." Bulletin de la société linguistique de Paris 44:64-71

Berger, Hermann. 1956. "Mittelmeerische Kulturpflanzennamen aus dem Burushaski." Münchener Studien zur Sprachwissenschaft 9:4-33

Berger, Hermann. 1959. "Die Burushaski-Lehnwörter in der Zigeunersprache." Indo-Iranian Journal 3:17-43

Berger, Hermann. 1960. "Bericht über sprachliche und volkskundliche Forschungen im Hunzatal." Anthropos 55:657-64

Berger, Hermann. 1962. "Der Stand der Burushaski-Forschung." Bulletin of the International Committee on Urgent Anthropological and Ethnological Research 5:42-4

Berger, Hermann. 1966. "Remarks on Shina Loans in Burushaski." Anwar S. Dil (ed.). Shahidullah Presentation Volume. Lahore: Linguistics Research Group of Pakistan (Pakistani Linguistics Series, 7). 79-88

Cirune, D. Brushaski: an extraordinary language in the Khakoram Mountains.

Berger, Hermann. 1968. "Zwei Erzählungen aus dem Hunza-Tal." Zeitschrift für Kulturaustausch 18:224-5 [Reprinted in Südasien-Anthologie: 44 Übersetzungen aus südasiatischen Literaturen, 1993]

Berger, Hermann. 1974. Das Yasin-Burushaski (Werchikwar). Grammatik, Texte, Wörterbuch. Wiesbaden: Harrassowitz (Neuindische Studien, 3)

Berger, Hermann. 1983. "Etymologische Bemerkungen zu einigen auf Geister und Geisterglaube bezügliche Wörter im Burushaski." P. Snoy (ed.). Ethnologie und Geschichte. Festschrift für Karl Jettmar. Wiesbaden: Franz Steiner. (Beiträge zur Südasienforschung, 86). 29-33

Berger, Hermann. 1985. "A Survey of Burushaski Studies." Journal of Central Asia 8:33-7

Berger, Hermann. 1994. "Kombinatorischer Lautwandel im Burushaksi." Studien zur Indologie und Iranistik 19:1-9

Berger, Hermann. 1998. Die Burushaski-Sprache von Hunza und Nager. Teil 1: Grammatik. Teil II: Texte mit Übersetzungen. Teil III: Wörterbuch. Wiesbaden: Harrassowitz (Neuindische Studien, 13)

Berger, Hermann, Karl Jettmar & Hugh van Skyhawk. 1996. Libi Kisar: ein Volksepos im Burushaski von Nager. Bearbeitet und herausgegeben von Hugh van Skyhawk. Mit Beiträgen und Ergänzungen von Hermann Berger und Karl Jettmar. Wiesbaden: Harrassowitz (Asiatische Forschungen. Monographienreihe zur Geschichte, Kultur und Sprache der Völker Ost- und Zentralasiens)

Bleichsteiner, R. 1930. "Die werschikisch-burischkische Sprache im Pamir-Gebiet und ihre Stellung zu den Japhetitensprachen des Kaukasus". Wiener Beiträge zur Kulturgeschichte und Linguistik I:289-331

Bloch, Jules. 1952. "Le Bourouchaski." A. Meillet & M. Cohen (eds.). Les Langues du Monde. Paris: Centre National de la Recherche Scientifique. 505-9

Borgstrom, Carl. 1945. "The Categories of Person, Number and Class in the Verbal System of Burushaski." Norsk Tidsskrift for Sprogvidenskap 13:130-47

Bouda, K. 1950. "Die Sprache der Buruscho." Eusko-Jakintza 4:32-50, 337-46

Bouda, K. 1954. "Buruschaski Etymologien, I." Orbis 3:228-30

Bouda, K. 1964. "Buruschaski Etymologien, II." Orbis 13:604-9

Buddruss, Georg. 1974. Review: H. Berger, "Das Yasin-Burushaski." Kratylos 19:153-55

Burú´saski Risár´c Komit.í. ca. 1982. Ináay Burú´saski, yarkamáasum báago. Hunzá-Gilgít-Kara´cí.

Burúsáski Risárc´ Komit.í. ca. 1984. Burú´saski Burjóoning. ´Saayá étum. Hunzá-Gilgít-Karac´í

Casula, Ilija. 1998. Basic Burushaski Etymologies. The Indo-European and Paleo-Balkanic Affinities of Burushaski. München: Lincom Europa (LINCOM Etymological Studies, 1)

Casule, Ilija. 2003."Burushaski Names of Body Parts of Indo-European Origin". Central Asiatic Journal. 47/1: 15-74

Casule, Ilija. 2003. "Evidence for the Indo-European Laryngeals in Burushaski and Its Genetic Affiliation with Indo-European". Journal of Indoeuropean Studies. 31/1-2 : 21-86

Casule, Ilija. 2004. "Burushaski-Phrygian Lexical Correspondences in Ritual, Burial, Myth and Onomastics". Central Asiatic Journal. 48/1: 50-104

Frembgen, J. 1997. "English Loan Words in Burushaski as a Barometer of Cultural Change." I. Stellrecht & M. Winiger (eds.). Perspectives on History and Change in the Karokorum, Hindukush, and Himalaya. Köln: Rüdiger Köppe. (Culture Area Karakorum, Scientific Studies, 3). 463-71

Frémont, Annette.1982. Contribution a l'étude du Burushaski. Dix-neuf récits inédits de Raja Ali Ahmed Jan (Nagir) avec mot-à-mot traduction, notes, commentaires et lexique. Thèse de Doctorat de Troisième Cycle, Université de la Sorbonne Nouvelle, Paris III. (unpublished)

Frémont, Annette. 1992. Récits inédits en Burushaski. Transcription - Traduction - Commentaire - Lexique. Tome I-II. Thèse pour le Doctorat d'état ès-lettres, Université Sorbonne Nouvelle, Paris III. (unpublished)

Grune, Dick. 1998. Burushaski. An Extraordinary Language in the Karakorum Mountains. Pontyporidd, Wales, UK: Joseph Biddulph Publisher

Hayward, G.W. 1871. "Hunza and Nager, and Yassin, Vocabularies." Journal of the Royal Geographical Society 41:18ff

Hunza'i, Ghulamuddin Ghulam. 1998. Nurah shul. Burushaski 'arifanah kalam ma' Urdu

tarjumah. Gilgit: J.M. Baig and Sons (In Urdu: parallel text in Burushaski)
Hunzai, Nasiruddin. 1960. Dîwân-i-Nasîrî. Karachi (religious poems in Burushaski, Urdu script)
Klimov, G.A. & D.I. Edel'man. 1970. Iazyk burushaski. Moscow: Akademia Nauk SSSR
Klimov, G.A. & D.I. Edel'man. 1972. "K nazvaniam paryx castei tela v iazyke burushaski." Etimologia 160-63
Klimov, G.A. & D.I. Edel'man. 1995. "K perspektivam rekonstruktsii istorii izolirovannogo iazyka. Na materiale iazyka burushaski." Voprosy Iazykoznaniia 5:27-38
Kreutzmann, Hermann. 1989. Hunza. Ländliche Entwicklung im Karakorum. Berlin (Abhandlungen - Anthropogeographie, Institut für geographische Wissenschaften, 44)
Leitner, G.W. 1889. The Hunza and Nagyr Hand-book. Being an Introduction to a Knowledge of the Language, Race, and Countries of Hunza, Nagyr, and a Part of Yasin. Calcutta
Leitner, G.W. 1889. "La langue, la religion et les moeurs des habitants du hounza." Paris: Academie des Inscriptions et Belles-Lettres. Comptes Rendus des Seances de l'Année 1889 4/17:350-54
Leitner, G.W. 1890. "On the Sciences of Language and Ethnography. With General Reference to the Language and Customs of the People of Hunza." Journal of the Transactions of the Victoria Institute 23:109-22
Leitner, G.W. 1891. "On the Ethnographical Basis of Language. With Special Reference to the Customs and Language of Hunza." Journal of the Royal Anthropological Institute 20:204-10
Lorimer, David L.R. 1932. "A Burushaski Text from Hunza." Bulletin of the School of Oriental Studies 4:505-31
Lorimer, David L.R. 1935-1938. The Burushaski Language. I: Introduction and Grammar; II: Texts and Translation; III: Vocabularies and Index. Oslo: Instituttet for sammenlignende kulturforskning
Lorimer, David L.R. 1935-37. "Nugae Burushaskicae." Bulletin of the School of Oriental Studies 8:627-36
Lorimer, David L.R. 1937. "Burushaski and its Alien Neighbours. Problems in Linguistic Contagion." Transactions of the Philological Society 63-98
Lorimer, David L.R. 1938. "A Note on Various Hunza and Shimshali Names." The Himalayan Journal 10:121-25
Lorimer, David L.R. 1962. Werchikwar English Vocabulary. Oslo: Instituttet for sammenlignende kulturforskning
Lorimer, E.O. 1939. Language Hunting in the Karakoram. London: George Allen and Unwin [Reprinted Karachi: Indus Publications, 1989]
Marchal, A., Etienne Tiffou & R. Warren. 1977. "A Propos du VOT. Le Cas du Bourouchaski." Phonetica 34:40-53
Morgenstierne, G., H. Vogt & C.Jh. Borstrøm. 1942. A Triplet of Burushaski Studies. I:

G. Morgenstierne: Notes on Burushaski Phonologiy. 61-95; II: H. Vogt: The Plural of Nouns and Adjectives in Burushaski. 97-129. III: C.Jh. Borgstrøm: The Categories of Person, Numbrr and Class in the Verbal System of Burushaski. 130-47 (Norsk Tidsskrift for Sprogvidenskap, XIII)

Morgenstierne, Georg. 1945. "Notes on Burushaski Phonology." Norsk Tidsskrift for Sprogvidenskap 13:59-95

Morin, Yves-charles. 1976. "La phonétique est-elle abstraite? Le cas du bourouchaski." Recherches linguistiques à Montréal, 5:175-80

Morin, Yves-Charles. 1976. "Contraintes de structure morphematique en bourouchaski." Actes du sixième congrès de l'association linguistique du nord-est (Recherches linguistiques à Montréal, 6). 197-203

Morin, Yves-Charles. 1976. "Naissance d'une contrainte de structure morphematique en bourouchaski." Recherches linguistiques à Montréal 7:157-62

Morin, Yves-Charles & Louise Dagenais. 1977. "Les emprunts ourdous en bourouchaski." Journal Asiatique 265:307-43

Morin, Yves-Charles, Jürgen Pesot & Etienne Tiffou. 1979. "Complement au lexique du bourouchaski du Yasin." Journal Asiatique 217:135-53

Morin, Yves-Charles & Etienne Tiffou. 1983. "Les tournures passives en bourouchaski." Shiro Hattori et al. (eds.). Proceedings of the XIIIth International Congress of Linguistis, August 29 - Spetember 4, 1982, Tokyo. Tokyo: Tokyo Press. 957-61

Morin, Yves-Charles & Etienne Tiffou. 1988. "Passive in Burushaski." Masayoshi Shibatani (ed.). Passive and Voice. Amsterdam: Benjamins. 493-525

Morin, Yves-Charles & Etienne Tiffou. 1989. Dictioinnaire complémentaire du Bourouchaski du Yasin Paris (Études bourouchaski, 2, Asie et monde insulindien, 17)

Nasir, Nasiruddin. n.d. Buruso Birkis. Burushaski/English Primer. Hunza: Bursaski Risarch Ekodami

Parkin, Robert J. 1987. "Tibeto-Burman and Indo-European Loans in Burushaski Kinship Terminology." Bulletin of the School of Oriental and African Studies 50:325-29

Patry, Richard & Etienne Tiffou. 1998. "Etude exploratoire des connecteurs de liaison dans un corpus de contes en bourouchaski du Yasin. Critères d'identification, quantité et distribution." Yves Duhoux (ed.). Langue et Langues: Hommage à Albert Maniet. Louvain-la-Neuve, Belgium: Peeters. 225-43

Pfeffer, Georg. 1984. "Kin-Classification in Hunza." Journal of Central Asia 7/2:57-67

Poucha, P. 1959/1960. "Bruza-Burushaski?" Central Asiatic Journal 5:295-300

Shah, Ijlal Hussain. 1994. The Pragmatics of Formality and Politeness in Burushaski and Shina. Islamabad: Quaid-i-Azam University (Unpublished M.Phil. Thesis)

Sindhi, Hyder. 1992. Selected Terms Used in Burushaski. Pakistan Studies. (Bi-Annual Research Journal, University of Balochistan). Vol 4 & 5

Skyhawk, Hugh van, Hermann Berger & Karl Jettmar. 1996. Libi Kisar. Ein Volksepos im Burushaski von Nager. Wiesbaden: Harrassowitz. (Asiatische Forschungen, 133)

(Includes Burushaski version of the Gesar and a German translation)

Tiffou, Etienne. 1977. "L'Effacement de l'ergatif en bourouchaski." Studia Linguistica: Journal of General and Comparative Linguistics 31:18-37 (Lund, Sweden)

Tiffou, Etienne & Yves-Charles Morin. 1982. "A Note on Split Ergativity in Burushaski." Bulletin of the School of Oriental and African Studies 45/1:88-94

Tiffou, Etienne & Yves-Charles Morin. 1982. "Etude sur le couleurs en bourouchaski." Journal Asiatique 270:363-83

Tiffou, Etienne & J. Pesot. 1988. Contes du Yasin. Paris (Études bourouchaski, 1)

Tiffou, Etienne & Jürgen Pesot. 1989. Contes du Yasin. Introduction au bourouchaski du Yasin avec grammarie et dictionnaire analytique. Paris: Peeters. (Asie et monde insulindien, 16. Etudes bourouchaski, 1)

Tiffou, Etienne & Yves-Charles Morin. 1993. "Le Préfix d- en bourouchaski du Yasin." André Crochetière et al. (eds.). Endangered Languages. Proceedings of the XVth International Congress of Linguists, Quebec, Université Laval, 9-14 August 1992. Sainte-Foy, Canada: PU Laval.

Tiffou, Etienne with the collaboration of Y.-C. Morin, H. Berger, D.L.R. Lorimer & Nassir Ud.d.in Hunzai. 1993. Hunza Proverbs. Calgary: University of Calgary Press

Tiffou, Etienne & Richard Patry. 1995. "Aspect et temps en bourouchaski du Yasin. L'Expression de l'antériorité et de la postériorité." Cahiers de l'Institut de linguistique de Louvain 21/3-4:139-71

Tiffou, Etienne & Richard Patry. 1995. "La Notion de pluralité verbale. Le Cas du bourouchaski du Yasin." Journal Asiatique 283/2:407-44

Tiffou, Etienne & Richard Patry. 1995. "La relative en bourouchaski du Yasin." Bulletin de la Société de Linguistique de Paris 90/1:335-91

Tiffou, Etienne. 1999. "Hermann Berger, Die Burushaski-Sprache von Hunza und Nager." Indo-Iranian Journal 42/3:283

Tikkanen, Bertil. 1988. "On Burushaski and Other Ancient Substrata in Northwestern South Asia." Studia Orientalia 64:303-25 (Helsinki)

Tikkanen, Bertil. 1991. "A Burushaski folktale, transcribed and translated: the frog as a bride, or, the three princes and the fairy princess Salasír." Studia Orientalia 67:65-125

Tikkanen, Bertil. 1994. "Burushaski." R.E. Asher (ed.). The Encyclopedia of Language and Lingusitics. Oxford: Pergamon Press. Vol. 1:437-38

Tikkanen, Bertil. 1995. "Burushaski Converbs in their South and Central Asian Areal Context." M. Haspelmath & E. König (eds.). Converbs in Cross-Linguistic Perspective. Structure and Meaning of Adverbial Verb Forms - Adverbial Participles, Gerunds. Berlin: Mouton de Gruyter. 487-528

Toporov, V.N. 1969. "K voprosu o tipologiceskoi blizosti eniseiskix iazykov i burushaski." Proisxozdenie aborigenov Sibiri i ix iazykov. 217-20

Toporov, N.V. 1970. "About the Phonological Typology of Burushaski." Roman Jakobson & Shigeo Kawamoto (eds.). Studies in General and Oriental Linguistics Presented to Shiro Hattori on the Occasion of His Sixtieth Birthday. Tokyo: TEC Corporation for Language and Educational Research. 632-47

Toporov, V.N. 1971. "Burushaski and Yeniseian Languages. Some Parallels." I. van Poldauf (ed.). Etudes de la phonologie, typologie et de la linguistique générale. Prague: Editions de l'Academie Tchecoslovaque des Sciences. 107-25

Varma, Siddheshwar. 1931. "Burushaski Texts." Indian Linguistics I:256-82

Varma, Siddheshwar. 1941. "Studies in Burushaski Dialectology." Journal of the Royal Asiatic Society of Bengal 7:133-73

Vogt, Hans. 1945. "The Plural of Nouns and Adjectives in Burushaski." Norsk Tidsskrift for Sprogvidenskap 13:96-129 (Oslo)

Willson, Stephen R. 1990. Verb Agreement and Case marking in Burushaski. Grand Forks, ND. (M.A. Thesis)

Willson, Stephen R. 1999. A Look at Hunza Culture. Islamabad: National Institute of Pakistan Studies and Summer Institute of Linguistics (Studies in Languages of Northern Pakistan, 3)

Willson, Stephen R. 1999. Basic Burushaski Vocabulary. Islamabad: National Institute of Pakistan Studies and Summer Institute of Linguistics (Studies in Languages of Northern Pakistan, 6)

Zarubin, I.I. 1937. "N.Ya. Marr i kandzhutskii (burisko-vershiksii) iazyk." Iazyk i myshlenie 8:165-70 (Moscow)

کتابیات کی فہرست Hunzai@yahoo.com اور

www.southasiabibliography.de/Bibliography/Burushaski/ burushaski.html. اور مندرجہ

ذیل اداروں کے تعاون سے تیار کی گئی ہے:

۱۔ کتب خانہ شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی

۲۔ کتب خانہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، صدر شعبۂ اردو، جامعہ کراچی

۳۔ کتب خانہ سید خالد جامعی، ناظم شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی۔

۴۔ بروشسکی ریسرچ اکادمی کراچی، ہنزہ

۵۔ معروف محقق اور بروشسکی ریسرچ اکادمی سے وابستہ محترمہ شہناز سلیم ہنزائی